انیس ناگی کے ناول "پتلیاں" کا وجودیت کے تناظر میں تنقیدی جائزہ

مقالہ برائے ایم۔فل (اردو)

مقالہ نگار:

کلیم اللہ

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

۲۰۲۱ء

انیس ناگی کے ناول "پتلیاں" کا وجودیت کے تناظر میں تنقیدی جائزہ

مقالہ نگار:

کلیم اللہ

یہ مقالہ

ایم فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگویجز

اردو زبان و ادب

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

۲۰۲۱ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیرِ دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگوئجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: انیس ناگی کے ناول "پتلیاں" کا وجودیت کے تناظر میں تنقیدی جائزہ

پیش کار: (کلیم اللہ) رجسٹریشن نمبر: MP-URD-F18-317612

(ماسٹر آف فلاسفی)

شعبہ: (اردو زبان و ادب)

ڈاکٹر محمود الحسن رانا ---------------

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی ---------------

ڈین فیکلٹی آف لینگوئجز

بریگیڈئیر سید نادر علی ---------------

ڈائریکٹر جنرل

(تاریخ)-----------------

اقرار نامہ

میں، کلیم اللہ حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز، اسلام آباد کے ایم فل سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر محمود الحسن رانا کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گا۔

کلیم اللہ

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز، اسلام آباد

۲۰۲۱ء

فہرست ابواب

ABSTRACT

In urdu novel writing ,where many names are worth mentioning because of their uniqueness in literary work ,the name of Anis Nagi holds great significance .He has not only upheld the tradition of novel writing but also secluded the realities of society through his simple and easy description.

Anis Nagy's name is also credible in that case because he wrote boldly on aspects of society .All the characters in the novel are just like puppets whose thread is in the hands of merciless time. It is the story of Mr. Jamil who is depressed due to the behaviours of his offsprings and his own intellecual conflicts.

The special reference of this novel is the presentation of existientialism elements . The research at hands would give us the suasion of existentialism of east and west.The documentary approach have been adopted in this research article.

"In " PUTLIYAN " there is a strong implaceability of fate, almost a desire to submit to fate. Fighting and struggling against fate either prove abortive or is never accomplished.there is no coming to terms with life's idiosyncsies.There is a pessimism and a cynicism of life reflected throughout the novel he has uncovered the difficult realities of family life, the contradictory attitudes of family members and the various layers of psychological conflict.

Anees Nagi set a new tradition of presenting existentialism elements in his novels.The critical approach related to pyschological state

and style have been applied in Anees Nagi's novel “PUTLIYAN” keeping in view the backdrop of existentialism so that aformentioned distinction could be brought forward.

اظہارِ تشکر

اس مقالے کی تکمیل پر میں صدقِ دل سے بار گاہِ خداوندی میں کلمہ ءشکر ادا کرتا ہوں کہ جس کی توفیق کے بغیر میرا یہ تحقیقی کام پایہ تکمیل تک پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ دورانِ تحقیق بہت سے موقعوں پر مشکلات سے دوچار ہونا پڑا، مگر ڈاکٹر محمود الحسن رانا کی سرپرستی نے بہت حوصلہ دیا۔ شعبہ اردو کے دیگر اساتذہ کرام میں ڈاکٹر عابد حسین سیال، ڈاکٹر شفیق انجم، ڈاکٹر نعیم مظہر، ڈاکٹر ظفر احمد، ڈاکٹر رخشندہ مراد، ڈاکٹر نازیہ یونس، ڈاکٹر ثوبیہ سلیم کی سرپرستی میرے لئے بہت بڑا اعزاز ہے۔

میں ڈاکٹر عرفان پاشا، صدر شعبہ اردو ایجوکیشن یونی ورسٹی فیصل آباد کا خصوصی شکریہ ادا کرنا چاہوں گا کہ جنہوں نے مجھے ضروری کتب فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ مفید مشوروں سے بھی نوازا۔ میں محمد مبشر ارشاد کا بھی میں دلی طور پر شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے میرے موضوع سے متعلقہ اہم کتب فراہم کیں۔ نذیر لائبریری، نمل اسلام آباد، ادارہ فروغِ قومی زبان، اسلام آباد کی لائبریری اور آن لائن ریختہ لائبریری کے ذمہ داران کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہوں گا۔ اپنے رفقاء کاران میں سے جناب زاہد عمران، لیکچرار اردو سپیشل ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ اور محمد اسحاق، لیکچرر اردو، گورنمنٹ ڈگری کالج آف سپیشل ایجوکیشن، راولپنڈی کے تعاون اور مدد کا بطورِ خاص ذکر کرنا چاہوں گا۔ ہم جماعت اسکالر جناب اعجاز رازق کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہوں گا کہ جنہوں نے تکنیکی مسائل کے حل میں میری مدد کی۔ تحقیقی عمل بلاشبہ ایک طویل اور کٹھن سفر تھا تاہم دوست واحباب اور اہلِ خانہ کا پر خلوص تعاون میرے لیے کسی نعمت سے کم نہ تھا۔ انہوں نے ہر ممکن حد تک میری ضروریات کا خیال رکھا اور مجھے ذہنی حوالے سے یکسو ہو کر تحقیق کرنے کا موقع فراہم کیا، جس کے لیے میں ان کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔

مرحوم قبلہ والد صاحب کی والہانہ محبت اس موقع پر بہت یاد آ رہی ہے۔ اللہ تعالی ان کے درجات بلند فرما کر انہیں کروٹ کروٹ جنت الفردوس میں اعلی مقام عطا فرمائے! آمین

آخر میں ایک بار پھر میں شعبہ ءاردو کے تمام اساتذہ اور بالخصوص صدرِ شعبہ پروفیسر ڈاکٹر فوزیہ اسلم صاحبہ، نگرانِ مقالہ ڈاکٹر محمود الحسن رانا اور کو آرڈینیٹر شعبہ اردو ڈاکٹر صائمہ نذیر کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا کہ جنہوں نے اس تحقیقی مقالے کی تکمیل میں میری مدد فرمائی۔

کلیم اللہ

باب اول

موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف۔ تمہید:

ا۔ موضوع کا تعارف

" پتلیاں" کے مصنف انیس ناگی ناول نگاری سے پہلے شاعری، ترجمہ نگاری اور تنقید میں خود کو منوا چکے تھے۔ ۲۰۰۱ء میں شائع ہونے والا ناول "پتلیاں" ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا ثبوت ہے۔ ناول نگاری میں انھوں نے روایت سے انحراف کر کے اپنی صلاحیتوں کا استعمال کیا اور "پتلیاں" جیسا ناول تخلیق کیا۔ "پتلیاں " میں مصنف نے وجودیت کے حوالے سے اہم تجربے کیے ہیں۔ اس کی بنیاد مصنف نے وجودی فکر پر رکھی ہے۔ یہ ناول زندگی کے رازوں سے پردہ اُٹھاتا ہے اور وجودی فکر کے مختلف عناصر کو کہانی، کرداروں کی نفسیاتی کشمکش اور مکالموں کے ذریعے ظاہر کرتا ہے۔

۲۔ بیان مسئلہ

انیس ناگی کے ناول" پتلیاں "کا مختلف جہات سے مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ جن میں سماجی، علامتی اور تمثیلی جہات نمایاں ہیں۔ تاہم اس ناول کا خصوصی حوالہ وجودی عناصر کی پیشکش ہے۔ انیس ناگی نے بطور خاص اس پہلو کو اپنی کہانی کی بنت میں پیش نظر رکھا ہے۔ لیکن وجودی تناظر میں ناول پتلیاں پر تحقیقی و تنقیدی کام نہ ہونے کے برابر ہے۔ لہذا مذکورہ تحقیق میں بیان مسئلہ یہ ہے کہ ناول پتلیاں کا وجودی تناظر میں تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا جائے۔ تاکہ وجودی فکر کے حوالے سے ناول کی تفہیم ہو سکے۔

۳۔ مقاصد تحقیق

مجوزہ تحقیق میں درج ذیل مقاصد میرے پیش نظر رہے ہیں۔

1. انیس ناگی کی ناول نگاری میں وجودیت کا جائزہ لینا۔
2. ناول پتلیاں کے موضوع میں وجودی فکر کے تصورات کا جائزہ لینا۔
3. انیس ناگی کے ناول ‘‘ پتلیاں ’’ کے کرداروں کی ذہنی کشمکش کا نفسیاتی جائزہ لینا۔

۴۔ تحقیقی سوالات

درج ذیل سوالات کو پیش نظر رکھ کر تحقیق کی گئی ہے۔

1. انیس ناگی کی ناول نگاری میں وجودیت کیا ہے ؟
2. ناول پتلیاں میں وجودی فکر کے کن تصورات کو پیش کیا گیا ہے ؟
3. انیس ناگی کے ناول "پتلیاں" کے کرداروں کی نفسیاتی کیفیات کیاہیں؟

۵۔ نظری دائرہ کار

محققین نے وجودیت کے بعض مبادیات کو قدیم یونانی فلسفہ میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وجودیت متعارف کروانے کا سہرا سورن کیگارڈ کے سر ہے۔ وجودیوں نے اپنے افکار لوگوں تک پہنچانے کے لیے فلسفیانہ مباحث سے زیادہ نظم، ڈراما اور ناول جیسے ادبی وسیلوں سے کام لیا ہے۔ چنانچہ اس لیے دنیائے ادب میں وجودیت دیگر مکاتب فکر کے مقابلے میں زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

وجودیت کے دو نمایاں رنگ ہیں ایک مذہبی (سورن کیگارڈ) دوسرا لادینی(ژال پال سارتر) ۔ وجودیت کی بنیاد اسی دعوے پر ہے کہ وجود جوہر پر مقدم ہے۔ سارتر کے نزدیک انسان پہلے وجود میں آتا ہے پھر اپنے جوہر کا انتخاب یا اپنے خواص کا اکتساب کرتا ہے۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں وجودیت کی بازگشت مشرق میں بھی ظاہر ہوئی اور اُردو ادب کے کئی جدید افسانہ نگار، ناول نگار اس طرز فکر کو لے کر آگے بڑھے ان میں انتظار حسین اور انیس ناگی اہم ہیں۔ انیس ناگی نے اپنے ناول "پتلیاں" میں فرد کی مایوسی، تنہائی، بے بسی، لایعنیت، محرومی اور کرداروں کی نفسیاتی کشمکش کو پیش کیا ہے۔

جدید وجودیت کے بانی سورین کرکیگارڈ نے کلیسا کی بالا دستی ختم کر کے فرد کے وجود کو وقار بخشا اور بابائے وجودیت کہلائے۔ وجودیت کے سلسلے میں دوسرا اہم نام سارتر کا ہے۔ سارتر کے نظریے کے مطابق سب کچھ انسان ہے جس کا وجود جوہر پر مقدم ہے۔ انسان وجود میں آتا ہے، اپنی ذات کا سامنا کرتا ہے اور پھر کائنات میں نمایاں ہو کر اپنے آپ کو منواتا ہے ۔ سارتر انیس ناگی کا پسندیدہ ادیب تھا۔ اس لیے وہ سارتر کے فلسفۂ وجودیت کے قائل نظر آتے ہیں۔ کامیو، کافکا اور ہائیڈگر وغیرہ نے بھی وجودیت کے متعلق نظریات پیش کیے ہیں۔

انیس ناگی اور سارتر کی رائے کے ساتھ ساتھ دیگر ناقدین کی رائے کو پیش نظر رکھتے ہوئے۔ ناول "پتلیاں" کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ "پتلیاں" کی کہانی اور کرداروں کے فکری، نفسیاتی امتیازات کو سامنے لانے کے لیے فلسفہ وجودیت سے متعلق دیگر اہم کتب سارتر کی "وجودیت" اور انسان دوستی، جاوید قاضی کی "وجودیت" اور انیس ناگی کی "وجودیت" اور نفسیات وغیرہ کا مطالعہ بھی کیا گیا ہے۔

۶۔ تحقیقی طریقہ کار

تحقیق کا موضوع انیس ناگی کے ناول "پتلیاں" میں وجودیت کا تنقیدی جائزہ ہے۔ زیرِ نظر تحقیقی مطالعے میں دستاویزی طریقہ کار اختیار کیا گیا ہے۔ جس میں بنیادی اور ثانوی مآخذات سے استفادہ کیا گیا۔ جبکہ ثانوی مآخذات میں فلسفہ وجودیت کی انگریزی کتب اور انیس ناگی سے متعلق چھپنے والے مضامین، کتب اور مختلف رسائل کا مطالعہ کیا گیا، جن تک رسائی کے لیے لائبریریوں سے رجوع کرنے کے علاوہ انٹرنیٹ اور دیگر مآخذات سے بھی حسبِ ضرورت استفادہ کیا گیا ہے۔

۷۔ مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق

انیس ناگی ایک نامور شخصیت ہیں اور ان کی ادبی خدمات کے حوالے سے مختلف مقالے لکھے جا چکے ہیں تاہم ان کے ناول "پتلیاں" کا تنقیدی جائزہ وجودیت کے حوالے سے ہنوز تشنہ تحقیق ہے۔ انیس ناگی پر سندی تحقیقی مقالات کی تفصیل کچھ یوں ہے:

۱۔ عمارہ رحمن، انیس ناگی کی ناول نگاری، شعبہ اُردو گورنمنٹ کالج لاہور۔

۲۔ سمیرا اسلم، انیس ناگی کی افسانوی نثر، پنجاب یونیورسٹی لاہور۔

۳۔ بے نظیر، انیس ناگی کے افسانوں کا فکری وفنی جائزہ، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد۔

۴۔ سارہ سعید، انیس ناگی کے ناولوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، یونیورسٹی آف ایجوکیشن لاہور ۲۰۱۰۔

۸۔ تحدید

زیرِ نظر تحقیق میں انیس ناگی کے ناول "پتلیاں" کا تنقیدی جائزہ وجودیت کے تناظر میں کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے دیگر ناول اور تنقیدی کام پس منظری مطالعہ کے طور پر تو پیشِ نظر رہے تاہم اس مقالے کا حصہ نہیں ہیں۔

۹۔ پس منظری مطالعہ

پس منظری مطالعہ کے طور پر فلسفہ وجودیت پر لکھی گئی انگریزی وار دو کتب اورانیس ناگی کی ناول نگاری پر لکھے گئے مقالات اوراس کے علاوہ وجودیت کے تناظر میں لکھے گئے آرٹیکل تبصروں اور تجزیوں کا بھی مطالعہ کیا گیاہے۔ اس سلسلے میں انیس ناگی کی دیگر ادبی تصانیف اور ان پر اب تک ہونے والے تحقیقی کام کو بھی پیشِ نظر رکھا گیاہے۔ اس کے علاوہ انٹرنیٹ اور دیگر ذرائع سے بھی استفادہ کیا گیاہے۔

۱۰۔ تحقیق کی اہمیت

انیس ناگی کی تحریروں نے اُردوزبان وادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کیاہے۔ انہوں نے اپنی ناول نگاری میں خارجی اور حقیقی زندگی کے ربط کو پیش کیاہے۔ انیس ناگی نے ناولوں میں ایک نئی روایت قائم کی اور وجودی عناصر کو پیش کیا لیکن اس حوالے سے اُن کے کام کو پرکھنے کی کوشش نہیں کی گئی، مزکورہ مقالے میں ناول "پتلیاں" میں وجودیت کے تناظر میں ان کی کہانی، کرداروں کی مخصوص نفسیاتی کیفیت اور مکالموں کا تنقیدی جائزہ لیا گیا تاکہ مذکورہ ناول میں بیان ہونے والے فلسفہ وجودیت کے فکری امتیازات سامنے آسکیں اور آنے والے سکالرز کی رہنمائی کرسکیں۔

ب۔ وجودیت کا مغربی ومشرقی تناظر: بنیادی مباحث

وجودیت کا آغاز تقریباً تیرہویں صدی میں ہوا انگلستان میں بادشاہی نظام تھا اس دور میں کسی نہ کسی قسم کے ظالمانہ ٹیکس عائد کیے گئے اس کے بعد اقتدار جب امویل کے ہاتھ آیا تو کیتھولک فرقے کے لوگوں پر قیامت برپا ہوئی مذہبی منافرت عام تھی۔ ہر طرف مذہبی جنونیت اور وحشت کا دور دورہ تھا کہ امویل کی موت کے بعد چارلس دوم کا دور اقتدار آیا تب عوامی زندگی میں عیش پرستی آگئی اس دور میں ہم جنس پرستی پروان چڑھی جرائم میں اضافہ ہو گیا اس طرح جب سترہویں صدی کا اختتام ہوا تو یورپ میں جنگ اور موت کا خوف پھیلا ہوا تھا بھوک افلاس اور غربت کا دور دورہ تھا ہر طرف مایوسی پھیلی ہوئی تھی۔

اسی صدی میں تھامس ہابزThomas Hobbes اور جان لاکJoln Locke جیسے دانشوروں نے عوامی حقوق کی بات کی اور جدوجہد شروع کی۔ اس کے بعد جب اٹھارویں صدی کا آغاز ہوا تو سپین میں حق جانشینی کی جنگ جاری تھی۔ اس جنگ میں انگلینڈ اور ہالینڈ سمیت کئی ممالک شامل تھے یورپ کے لوگ ابھی

سانس بھی نہ لے پائے تھے کہ جنگ پھر بھڑک اٹھی ۱۷۵۶ءسے ۱۷۶۳ءسے فرانس میں عوام اور حکمرانوں کے درمیان ایک کشمکش موجود تھی مذہبی آزادی کا فقدان تھا۔

"پروٹسٹینٹ فرقے کی تبلیغ ممنوع تھی اور چھپ چھپا کر یا تنہائی میں ہی ممکن تھی یہودیوں کو غیر ملکی سمجھا جاتا تھاان کی حالت زلت آمیز تھی کیتھولک قانونی طور پر پابند تھے کہ اپنے مزہبی احکامات اور رواجوں، روزہ کے دنوں اور ایسٹر کے چلے کی پابندی کریں چرچ در گزر کا مخالف تھا اور اسی وجہ سے والٹییئر کی مخالفت مول لی کسی کو شخصی آزادی حاصل نہ تھی حکام جیسے چاہتے بغیر کسی وجہ کے اور بغیر کوئی صفائی کا موقع فراہم کیے جب تک چاہتے ملزم کو قید میں رکھتے اور نہ ہی کوئی عوامی اجتماع کر سکتے تھے اور نہ ہی کوئی انجمن یا سوسائٹی بناسکتے تھے۔"(۱)

اس دور میں روسو، مانٹسکو اور والٹیئر جیسے دانشور پیدا ہوئے جنہوں نے مذہبی سماجی پابندیوں کے خلاف آواز بلند کی۔ اور لوگوں کو ان کے حقوق سے آشنا کرانے کی سعی کی ان سب کا مقصد صرف عوام کے مسائل و مصائب کا حل تھا انہوں نے زندگی اور معاشرت کو بلکل نئے انداز سے پرکھا اور معاشرے کے لیے کچھ نئی اقدار کی تفہیم کو ممکن بنایا ان کی تحریر و تقریر نے مردہ دلوں میں نئی زندگی پھونک دی اور نتیجتاً انقلاب فرانس کی راہ ہموار ہوئی

"۱۴جولائی۱۷۸۹ء کو حقوق کی جدوجہد خون آشام ہو گئی ۔لوگوں نے اسلحہ کی دکانوں کو لوٹ لیا اور مسلح ہو کر بسٹل کے قلعے پر حملہ آور ہوئے جہاں سے شہر کے مشرقی حصے پر نظر رکھی جاتی تھی۔ اور ساتھ ہی یہ قلعہ ایک نفرت انگیز شہرت کی حامل ریاستی جیل اور ایک ظالمانہ حکومت کی علامت تھا کئی گھنٹے کی گھمسان کی جنگ کے بعد قلعہ ان کے ہاتھوں میں تھا۔انہیں تقریباً دو سو آدمیوں کا نقصان اٹھانا پڑھا، جو ہلاک یا زخمی ہوئے ہجوم نے قلعے کی کمان دار اور کئی سوئس محافظوں کو وحشیانہ انداز میں قتل کر دیا۔"(۲)

جب اٹھارویں صدی ختم ہوئی تو پورا یورپ سماجی ابتری کا شکار تھا عصمت فروشی کو اتنا بڑھا وا ملا۔ انیسویں صدی کا آغاز ہوا تو فرانس میں نپولین بوناپارٹ ۱۸۰۴ء تا ۱۸۱۴ء حکمران تھا اس دوران بہت سی جنگیں ہوئی ۔ بیسویں صدی میں کارل مارکس کے نظریات اور تعلیمات کے زیر اثر روس میں انقلاب برپا ہوا۔اسی دوران جاپان کے دو شہروں پر ایٹم بم گرائے گئے سابقہ صدی کا یہی خلفشار بے چینی اضطراب جنگوں

کی تباہ کاریاں موت کی ارزانی۔ آمریت بار بار کی بغاوتیں عقائد اور روحانی اقتدار کا زوال مذہب کے نام پر ہونے والا خون اور زندگی میں آنے والے رویے کی وجہ سے فرد اپنے موضوع کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہوا اپنی موضوع کی طرف فرد کی یہی مراجعت وجودیت کے فلسفے کا جواز ہے۔بقول سی اے قادر:

"یہ اس دور کی پیداوار ہے جب انسان اپنی تمام اقدار کھو بیٹھا ہے یہ دور یورپ میں عالمی جنگوں سے پیدا ہوا انسان وحشیوں اور درندوں کی طرح لڑا ہر قدر کو ٹھکرا دیا گیا نہ اخلاق کا پاس رہا نہ مذہب کا جنگوں نے دونوں کو تباہ کر دیا نوجوانوں کو احساس ہوا کہ ماضی کا اخلاق ان کے مسائل حل نہیں کر سکتا اور مذہب کی طفل تسلیاں ان کی بے چینی دور نہیں کر سکتیں اگر پرانی اقدار ختم ہو چکیں مذہب ناکارہ ہو گیا ہے اور فلسفہ دوراز قیاس باتوں کا مجموعہ بن گیا ہے تو انسانی درد کا مداوا کیا ہے ۔ اس سوال کا جواب وجودیت نے پیش کیا۔"(۳)

انسانوں کے پیدا کردہ ماحول نے اخلاقی اور اقداری بحران پیدا کر دیا تو انسانوں کو اس کا حل وجودیت میں نظر آیا قاضی جاوید حسین کا خیال ہے کہ:

"یہ ابتری و مایوسی تمام تسلیم شدہ روایات کے خلاف بغاوت مادہ پرستی کا تخیل فکر ادب و فن میں جذبہ وحدت کا انتشار و عدم تحفظ کا احساس سماجی سیاسی مذہبی اخلاقی و جمالیاتی اقدار کی شکست وریخت جن سے ہماری ثقافت صورت پذیر ہوتی ہے نے وجودی فلسفے کو خام مواد فراہم کیا۔ " (۴)

جب مختلف سیاسی و سماجی مسائل فرد کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں تو اس کے ہاں ایک بیگانگی بے چارگی اور مایوسی کا احساس پیدا ہوتا ہے اس کے داخل کی دنیا میں ایک خلا پیدا ہو جاتا ہے حالات و واقعات کے سامنے فرد اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتا ہے اور اس کی ذات ایک سوالیہ نشان کی زد میں آجاتی ہے مگر مسائل کے باجوود فرد اپنے داخل کی اہمیت سے دستبردار نہیں ہوتا اور یقین ذات اسے حالات واقعات سے بغاوت پر اکساتے ہیں یہی بغاوت فلسفہ وجودیت کی تمہید بنتی ہے۔ وجود کی بنیاد عقل نہیں ہے اور نہ ہی وجود تعقل کی بنیاد پر قائم کسی بھی نظام کو تسلیم کرتا ہے۔یہ ہیگل کے اس نقطہ نظر کی بھی نفی ہے جس میں فرد اپنے

جوہر کے حوالے سے اپنا اثبات تلاش کرتا ہے اور عقل کو بنیاد تسلیم کرتا ہے۔ وجود نہ صرف عقل کو تسلیم نہیں کرتا بلکہ طے شدہ جواہر کو بھی تسلیم نہیں کرتا. بقول بختیار حسین صدیقی:

"وجود علم نہیں شخصی عمل و فلسفہ ہے۔ یہ فیصلہ انسان جذبے کی پوری قوت اور آزادی سے کرتا ہے۔ کوئی اخلاقی اصول، کوئی سماجی قانون، کوئی عقلی تصور، کوئی معروضی نظریہ اس کے فیصلے کا محرک نہیں......وہ خالص داخلیت کی روشنی میں اپنے لائحہ عمل کا فیصلہ کرتا ہے۔" (۵)

فلسفہ وجودیت کے بانی سارتر نے ساری زندگی میں اپنے لئے نہ کوئی گھر بنایا نہ شادی کی۔ سارتر کے نزدیک ہر آدمی اپنی زندگی میں ایک ایسا کردار ضرور ادا کرتا ہے جو اس کی حقیقی زندگی میں نہیں ہوتا۔ جب بھی وجودیت کا لفظ سامنے آئے تو سارتر کا نام ذہن میں آجاتا ہے، سارتر اور وجودیت اس عہد میں لازم وملزوم ہو کر رہ گئے ہیں۔ سارتر کے نزدیک ہر آدمی اپنی زندگی میں ایک ایسا کردار ضرور ادا کرتا ہے جو اس کی حقیقی زندگی میں نہیں ہوتا. سارتر کا کہنا ہے کہ آزادی حاصل کرنے کی اذیت سے جو لوگ چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں اور آزادی کا انتخاب کرنے سے پرہیز کرتے ہیں اور اپنے گرد مذہب، اخلاق اور معاشرتی اقدار کے ہیولے بنا لیتے ہیں جس طرح ریشم کا کیڑا اپنے گرد ریشم کے تار بنتا رہتا ہے اور پھر ایک دن وہ اپنے ہی بنے ہوئے جال میں دم توڑ دیتا ہے۔ ان لوگوں کا بھی یہی حال ہوتا ہے اور وہ بھی اخلاق، مذہب اور معاشرتی ہیولوں میں پھنس کر مر جاتے ہیں۔ سابقہ صدیوں کا یہی خلفشار، بے چینی، اضطراب، جنگوں کی تباہ کاریاں، موت کی ارزانی، جبر، آمریت، بار بار کی بغاوتیں، عقائد اور روحانی اقدار کا زوال، مذہب کے نام پر ہونے والا کشت خون، سائنس وصنعت کی ترقی در پیش آنے والے رویے، فرد کے لیے بے حد اذیت ناک ثابت ہوئے اور آخر فرد اپنے موضوع کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہوا اپنی موضوع کی طرف فر کی یہی مراجعت وجودیت کے فلسفے کا جواز بنی۔

قیام پاکستان سے پہلے برصغیر پاک وہند اس لحاظ سے ایک منفرد سرزمین تھی کہ یہ باقی دنیا سے ایک عرصے تک کٹی رہی ۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ محمد بن قاسم سے شروع ہوا جو بالآخر ۱۵۲۶ء میں مغلیہ سلطنت کے قیام پر منتج ہوا اور مغلوں کی عظمت کا وہ چراغ جو ظہیر الدین بابر نے روشن کیا تھا بالآخر بہادر

شاہ ظفر کے دور میں ٹمٹمانے لگا۔ کمپنی بہادر سے نجات حاصل کرنے کی آخری کوشش ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی کی صورت میں ظاہر ہوئی جو ناکامی پر منتج ہوئی ۔اس کے بعد نہ صرف ہندوستان غلام بن گیا بلکہ ہندوستانیوں پر دکھوں اور غموں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے دلی کی گلیاں انسانی خون کے جوہڑوں میں تبدیل ہو گئیں مگر انگریز کے انتقام کی آگ ٹھنڈی نہ پڑی۔ عمومی طور پر ہندوستانی اور خصوصی طور پر مسلمان اس انتقام کا شکار ہوئے۔

۱۸۵۷ء ءمیں برطانوی پارلیمنٹ نے ایک قانون پاس کیا جس کی رو سے انسان کو عملی طور پر تاج برطانیہ کے زیر نگیں اک نو آبادی قرار دیا گیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کا کنٹرول ختم کر دیا گیا پھانسی گھاٹوں کی تعداد بڑھنے لگی کالے پانی کی سزائیں عام ہوئیں ایسے ہی ایک باغی مولانا محمد جعفر تھانیسری تھے جنہیں پہلے سزائے موت سنائی گئی پھر پھانسی کی سزا موت ہوئی اور "کالا پانی "کی سزا ہوئی ،لکھتے ہیں:

> "آخر اکتوبر ۱۸۶۵ء جس دن ہم لاہور سے روانہ ہوئے ،ریل کے اسٹیشن تک پاؤں میں بیڑی ،سر پر بسترہ، جس کو ایک ہاتھ سے تھامے ہوئے اور دوسرے ہاتھ میں ہتھکڑی کی کلجوٹ، اس پر سپاہیوں کی مار مار کے جلدی چلو ریل تک پہنچے ،وہاں جا کر ریل کی کوٹھڑیوں میں ہم کو بند کر کے قفل لگا دیا اور لاہور سے ملتان تک راہ میں کہیں نہ کھولا۔ مثل جانوروں یا مال کے گاڑیوں میں بھر دیا تھا ملتان سے ہم کو اگنبوٹ پر سوار کرایا ہم جکڑے پڑے تھے۔ پانچ چھ روز بعد ہم کو ٹلی پہنچے کوٹلی سے ریل میں سوار ہو کر ہم کراچی پہنچے۔"[۶]

کراچی سے یہ قیدی بمبئی لے جائے گئے جہاں سے کالا پانی کا سفر شروع ہوا۔ ظلم و جبر کا یہ سلسلہ بلا امتیاز جنس و مذہب سب ہندوستانیوں کے لیے تھا واضح رہے کہ یہاں لائی جانے والی لڑکیاں اور عورتیں اکثر مرد قیدیوں کے جنسی تشدد کا شکار ہوتی تھیں۔ مقامی لوگ ہر وقت حکومت کے خوف اور دبدبے سے سہمے رہے۔

ہندوستان میں بیسویں صدی کا آغاز سابق صدیوں کے مقابلے میں بے حد عجیب و غریب تھا۔ ریلوے کا آغاز ہو چکا تھا تار گھر اور ٹیلیفون کی سہولت دستیاب تھی ۔ہندوستان کے عوام اس وقت شدید مالی مشکلات کا شکار تھے ۔ذرائع پیداوار اور ذرائع روزگار نہ تھے کاشتکاری ،چھوٹی موٹی تجارت یا سرکاری

نوکری، بھوک اور جہالت کا دور دورہ تھا مشرقی روایات اور علوم جدید دور کے تقاضوں سے غیر ہم آہنگ ہونے کے باعث اپنی افادیت اور اہمیت کھونے لگے۔ انگریزوں نے نئے اداروں کی بنیادیں رکھی جن کے لیے انہیں افرادی قوت درکار تھی۔ انگریزی تعلیم مجبوری تھی مگر ہندوستانیوں کے خمیر میں ہندوستان کی مٹی کی خوشبو رچی تھی یہ ساری صورت حال ہندوستان کے باسیوں کے لیے ایک جذباتی مسئلہ تھی اور ان کے جذبوں میں ایک شدید گرمی موجود تھی ۔ حکمرانوں کا استبداد آئے دن نئی صورت میں سامنے آتا تھا:

"ایسٹ انڈیا کمپنی کی جابرانہ حکومت رفع ہونے کے باوجود ملک کے حالات پوری طور پر قابل اطمینان نہ تھے۔ گورنمنٹ نے نئے ٹیکس عائد کئے اسٹامپ ایکٹ کے خلاف لوگوں میں خصوصیت سے بیزاری تھی۔ انصاف لوگوں کا حق ہے اور حکومت کی ذمہ داری مسلمانوں نے سات سو برس یہ ذمہ داری بغیر کسی معاوضے کے پوری کی تھی اور ہندو بھی اس کے عادی ہو چکے تھے لہذا انہوں نے بھی اسٹامپ کو انصاف کا معاوضہ سمجھا قانون اسلحہ نافذ کیا گیا اور بڑی سختی کے ساتھ ملک میں قحط پڑے۔ پولیس بڑی درشت تھی اور اس کے اختیارات نہایت وسیع تھے ان حالات کے خلاف لوگوں میں نفرت اور غصہ تھا۔"(۷)

انگریزوں نے ہندوستان کے سماجی اور تہذیبی اثاثے کو برباد کرنے کے لیے انتہائی چالاکی سے سے لائحہ عمل طے کیا اور سب سے پہلا حملہ لسانی اثاثے پر کیا گیا ۔ فارسی کی جگہ انگریزی کو سرکاری زبان قرار دیا گیا۔ اردو ہندی تنازعہ اسی سیاسی چال بازی کا نتیجہ تھا۔ ابھی نفرتوں کے طوفان بھرے نہیں تھے کہ ۱۹۰۵ ء میں تقسیم بنگال کا اعلان ہوا۔ دوسری طرف مسلمان اس تقسیم پر خوش تھے اسی دوران ۱۹۰۶ ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا اور اسی طرح جہاں مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم دستیاب ہوا وہاں بے شمار لوگ اس بربریت کا شکار بھی ہوئے ہزاروں مسلمان قتل کر دیے گئے ان کے گھر اور فصلیں جلا دی گئی

جولائی ۱۹۳۵ء میں ہندوستان کے لیے نیا آئین پاس ہوا جسے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کا نام دیا گیا ۔ اکثر رہنماؤں نے اس ایکٹ کی مخالفت کی۔ اسی دوران اشتعال انگیزی دوبارہ شروع ہو گئی اور مسلمانوں پر ظلم و جبر کرنے لگے جہاں مسجدوں کی بے حرمتی کی جانے لگی مسلمانوں کے دین کا مذاق اڑایا گیا اور پھر فسادات پھوٹ پڑے دوسری طرف یورپ میں جنگ کے بادل منڈلانے لگے ہندوؤں اور مسلمانوں نے انگریزوں کو ہر قسم کے تعاون کا یقین دلایا انگریز سامراج اپنے اقتدار کی بقا کی جنگ لڑ رہا تھا 14 اگست

1947 کو پاکستان کے قیام اور ہندوستان کی آزادی کا اعلان ہوا مسلمان خوش تھے کہ منزل مراد ملی مگر ہندو پریشان اور افسردہ تھے کہ دھرتی ماتا کا بٹوارہ ہو گیا۔ عبدالکلام آزاد نے اپنی کتاب میں لکھا:

"اگست کی 14 تاریخ تاریخ پاکستان کے مسلمانوں کے لیے لیے خوش کن تھی یتیموں اور سکھوں کے لیے ماتم کا دن تھا تھا مجھے بلکہ کانگریس کے اہم رہنماؤں کے جذبات بھی ایسے ہی تھے تے اچاریہ کرپلانی ی اس وقت کانگریس کا صدر تھا اس کا تعلق سندھ سے تھا چودہ اگست انیس سو سینتالیس کو اخباری بیان جاری کیا کہ یہ دن ہندوستان کے لئے تباہی اور بربادی کا دن ہے تمام پاکستان میں ہندوؤں اور سکھوں نے اسی قسم کے جذبات کا اظہار کیا۔"(۸)

ان حالات کے بعد بے شمار لوگ بربریت کا شکار ہوئے۔ اس دوران سیاستدان بھی بہت زیادہ چالیں چل رہے تھے مگر عوام تو اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے ان ہنگاموں میں مرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی لوگ مر رہے تھے۔ آگ اور خون کی ہولی ہر طرف جاری تھی قیام پاکستان کے بعد سیاسی عدم استحکام اور انتشار کا شکار ہو گیا۔ سب سے بڑا مسئلہ مہاجرین کا تھا جب یہ مہاجرین پاکستان پہنچے تو یہاں وسائل اور ذرائع کی شدید کمی تھی نتیجتاً بھوک افلاس اور غربت کا سیلاب رقص کرنے لگا۔ بلاشبہ ان جنگوں نے براہ راست یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور برصغیر بالواسطہ ہیں اسی کرب سے آشنا ہوا اس تجربے کو اپنے وجود پر یورپ نے ہی برداشت کیا اور انہوں نے ہی اس حملے کو من و عن قبول کیا۔ لیکن برصغیر بھی بالواسطہ طور پر اسی کرب سے آشنا ہوا۔ مذہبی اور اخلاقی تباہی نے انسان کی توجہ اپنے وجود کی جانب مبذول کی اور داخلیت پر انحصار کرنا شروع کیا اور مسائل کا حل تلاش کیا۔ چنانچہ اس بحران نے نے وجودیت کے فلسفے کو تشکیل دیا۔ اور عالمی جنگوں سے پیدا ہونے والے حالات و واقعات نے انسان کو داخلی کرب اور غیر عقلی حقائق کی طرف مائل کیا۔ وجودیت کو دو اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے دینی اور لادینی وجودیت مغرب کے طرح مشرقی وجودیت پسند ادیبوں نے فرد کی آزادی کو ایک قدر کے طور پر پیش کیا اور جبر، انتشار، بے چینی، کرب، تشدد کو اپنی تحریروں کا حصہ بنایا۔ وجودی کردار آزادی کے گرد گھومتے ہیں۔ وہ ہر لمحہ اپنے آپ کو ایک نئے موقف ایک نئی صورت حال کا شکار پاتے ہیں۔ وجودیت نے انسان کو مایوسی دی مگر اس فلسفے میں صداقت اور گہرائی ضرور ہے۔ جس نے اردو ادب کے ادیبوں کو بھی بالواسطہ طور پر اپنے اثرات کی لپیٹ میں لے لیا۔

ج۔ انیس ناگی کا تصورِ وجودیت

وجودیت جسے انگریزی میں Existentialism کہتے ہیں ۔ بیسویں صدی کا ایک ہمہ جہت نظریہ ہے جو سلسلہ وقت میں وسعت آشنا تو ہوا مگر ملحدانہ خیالات کے سبب انسانیت کو کوئی بڑی نوید سنانے سے قاصر رہا۔ اس کی بنیاد اس نکتے پر ہے کہ وجود جوہر پر مقدم ہے مشہور قول "جوہر موجود سے پہلے ہے" کی ضد ہے اسے "میں سوچتا ہوں، اس لیے میں ہوں" کا متضاد بھی کہا جاسکتا ہے۔ یوں اس کا مفہوم یہ بر آمد ہوتا ہے کہ "میں ہوں اس لیے میں سوچتا ہوں۔" وجودیت کا نظریہ دراصل انسان کے مابعد الطبیعاتی نظام سے رشتہ جوڑنے کے سبب پیدا ہوا۔ یورپ کے سماجی، سیاسی اور اقتصادی حالات نے فرد کو بے چارگی اور عدم تحفظ کے احساس سے دوچار کر دیا تھا۔ لہٰذا وہ عیسائیت کے عقاید کی نئے سرے سے تشریح کرنے لگا تھا انسان نے زماں و مکاں Time and Space کے وسیع تر تناظر میں خود کو تنہا اور بے یار و مددگار پایا تو اسے ہر چیز لغو اور بے معنی دکھائی دینے لگی۔ سماجی رشتوں سے عدم وابستگی، ذہنی انتشار اور دل گرفتگی اس لایعنیت کے حاصلات کہے جاسکتے ہیں ۔ وجودیت کو عقل پرستی کے خلاف اعلان جنگ بھی کہا جاسکتا ہے۔ وجودیت میں وجود کو جوہر پر سبقت دی گئی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ بنیادی چیز انسان کا وجود ہے انسان کا وجود ہے تو سب کچھ ہے اور وجود نہیں تو کچھ بھی نہیں پس انسان اپنا خود ہی ذمہ دار ہے وہ اپنے ارادے میں آزاد اور خود مختار ہے۔ قول و فعل میں آزادی کا مطلب یہ ہوا کہ کسی انسان کے بننے بگڑنے کی تمام تر ذمہ داری اس کے سر ہے۔ اس نظریہ میں انسانی وجود کو بنیادی حیثیت حاصل ہے ہے میں کون ہوں! میں کہاں ہوں! اور میرے ہونے اور نہ ہونے کی حقیقت کیا ہے! وجودیت کے نمایاں سوالات ہیں ۔ نظریہ وجودیت میں انہی سوالات کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے سورین کرکیگارڈ اور ژاں پال سارتر کے خیالات وجودی فکر میں حساس کا درجہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے باقاعدہ ایک نظام فکر ترتیت دیا ہے جس میں کائنات میں انسان کی حیثیت اور اس کے کردار پر بحث کی گئی ہے۔ ان کے نظام فکر کا ماحصل یہ ہے کہ انسان کا وجود ہر چیز پر مقدم ہے۔ وجود ہے تو باقی چیزیں بھی ہیں اور وجود نہیں تو کچھ بھی نہیں ۔ گویا انسان اپنے وجود کا خود ذمہ دار ہے پھر یہ ذمہ داری اس کی ذات تک ہی محدود نہیں بلکہ وسیع تر معنی میں وہ پوری انسانیت کے اعمال کا جواب دے ہے ذمہ داری کے احساس کو وجودی فکر میں کرب کا نام دیا گیا ہے، بے کسی ،مایوسی ،خوف، تشویش، دہشت، نیستی ،کراہت بیگانگی، جبریت، لایعنیت لغویت اور لاتعلقی کی وجودیت کی دیگر اصطلاحات ہیں ۔ انیس ناگی کی

وجودی شخصیت کے پیچھے ان کے نجی حالات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے والد کی بے پناہ سرکاری ذمہ داریوں، بار بار ایک شہر سے دوسرے شہر میں تبدیلیوں اور گھریلو سطح پر بھائی بہنوں کی کثرت اور بچوں پر انفرادی توجہ کی کمی نے ان کی فطری ضد اور ہٹ کو دو آشنا کر دیا تھا۔ یوں دیکھا جائے تو انیس ناگی کوئی بناوٹی قسم کے وجودی ناول نگار نہیں تھے۔ بلکہ وجودیت ان کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئی تھی۔ اپنے تخلیقی سفر کے دوران میں سورین گرکیگارڈ، ژاں پال سارتر، البیر کامیو اور کافکا وغیرہ کی تحریروں کے مطالعہ نے ان کی باطنی وجودیت کو مزید تقویت ملی تو وہ اول سے آخر تک وجودی تخلیق کار بن گئے۔

انیس ناگی کے ناولوں، ناولٹوں اور افسانوں میں نظریہ وجودیت کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ ان کی تحریروں کے مطالعہ کے دوران قدم قدم پر وجودی اصطلاحات سے واسطہ پڑتا ہے جو ان کے وجودی ہونے پر دلیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ پھر ان کے افسانوی ادب میں اُبھرنے والے کردار بھی، جودی افکار و اعمال کے حامل ہیں۔ ان کے کرداروں کا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا سونا جاگنا اور جینا مرنا سب جودی فکر کے تابع ہے۔ وہ حالات پر قابض ہونے کی کوشش کرتے ہیں مگر ناکامی کی صورت میں بلا حیل و حجت پسپائی اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ چیز ان کرداروں کی شخصیت پر وجودیت کی مہر ثبت کر دیتی ہے۔ انیس ناگی کی طرح ان کے کردار بھی زندگی کی لایعنیت کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک سامنے کی چیزیں اہم ہیں اور دیوار کے پیچھے کچھ نہیں ہے۔ انیس ناگی نے انھیں ایک دوسرے کا تضاد ثابت کیا ہے۔ وہ ضرورت کے تحت فریق ثانی کو اہمیت دیتے ہیں اور جب ضرورت پوری ہو جاتی ہے تو لاتعلقی کے راستے پر چل نکلتے ہیں، چاہے دوسرا شخص اُن کا بھائی بہن یا باپ ہی کیوں نہ ہو۔ انیس ناگی کے ناول "چوہوں کی کہانی میں" بیٹے کی باپ سے لاتعلقی کی مثال ملاحظہ ہو:

> "مجھے اپنے بیٹے سے محبت ہے لیکن میرے بیٹے نے محبت کے اس فتنے سے انکار کر دیا ہے اس نے مجھے دیکھا تھا کہ میں ایک الگ وجود ہوں اور ہر وجود دوسرے کی مداخلت پن نہیں کرتا، آپ نے لکھا پڑھا دیا، اس کا میں شکر گزار ہوں، اب میرے اور اس کے درمیان رشتے کی بنیادیں کمزور ہو چکی ہیں ۔ پہلے مجھے اس کا شدید غم تھا، پھر کچھ مہینوں کے بعد یہ مدہم ہوتا گیا۔ اور اب یوں ہے کہ میرا یا میرے لیے ایک ملاقاتی بن گیا ہے۔"(۹)

وجودی شخص معروضی کی بجائے تجربے کو مانتا ہے۔ وہ ذاتی تجربے اور علم کے سہارے آگے بڑھتا ہے اور اپنے تجربات کو زندگی کے انتقادات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتا ہے ۔ یوں وجوی فکر میں

اشتراک کی بجائے عدم اشتراک اور اتفاق کی بجائے عدم اتفاق کی کیفیات عام ہوتی ہیں اور اپنا آپ دوسروں کے حوالے سے حاصل کرتا ہے جو اس کا تضاد ہوتے ہیں۔ وجودی فکر میں فرد کو گروہ میں ضم کرنے والے سماجی نظریات کی گنجائش نہیں ہوتی تاہم انسان کی باہمی اخلاقیات اس کا ایک بڑا موضوع ہے۔ اس کے تحت فرد معاشرے کا حصہ ہو کر ہی معاشرے سے جدا ہے۔ وہ معاشرے میں ضم نہیں ہو سکتا۔ اپنے مفادات کا تحفظ اس کی پہلی ترجیح ہوتی ہے اور اس کی تمام تر کوششیں اسی نقطے کے گرد گھومتی ہیں وہ دوسروں کے کندھوں پر سوار ہوتا ہے اور نہ اپنے کندھوں پر سوار کرتا ہے۔ اس کا تشخص اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ زندگی کے سفر میں دوسروں کے متوازی چلے اور اپنے وجودی حصار پر آنچ نہ آنے دے، چنانچہ وہ معاشرے کے دیگر افراد یہاں تک کہ اپنے بھائی بہنوں اور ماں باپ سے الگ اپنے وجود کا مکلف ہوتا ہے۔ اُسے کسی سے غرض نہیں ہوتی۔ خود غرضی کا یہ انداز درج ذیل اقتباسات کے ایک ایک فقرے سے عیاں ہے:

> j"اُس کے اور اُس کے بیٹے کے درمیان فاصلہ تھا۔ دونوں میں تصرف عمر کا خط کشیدہ تھا بلکہ دو زمانے حائل تھے، وہ جو کچھ کہتا اس کا بیٹا اس کی تردید کرتا ۔ دیکھو تم ابھی نویں جماعت میں پڑھتے ہو تمہاری عادتیں بے ترتیب ہیں۔ دیر تک ٹیلی ویژن دیکھتے ہو چھٹی کے دن سوتے رہتے ہو گھر کے کسی کام میں تمہیں دلچسپی نہیں ہے۔ تمہاری کتابیں اور کپڑے ہر جگہ بکھرے ہوئے ہیں ۔ تمہاری زبان تیز ہے ۔ سکول میں تم مہذب اور گھر میں وحشی ، میں تمہارے لئے ایک اچھا مستقبل چاہتا ہوں اس کا بیٹا بے اختیار ہنسنے لگا تھا۔ بابا آپ بوڑھے ہو چکے ہیں۔ پرانے ہیں آپ اپنے مستقبل کی فکر کریں میرا پیچھا چھوڑ دیں۔ حامد نے سب کچھ خاموشی سے سن لیا تھا۔"[۱۰]

انسان وہ نہیں ہے جو کچھ وہ نظر آتا ہے وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے باطن کو ظاہر ہونے سے روکتا رہتا ہے۔ کیوں کہ اس میں ممنوعہ کی حد توڑنے کا رجحان بڑا قوی ہوتا ہے۔ یہ زندگی بسر کرنے کا ایک سمجھوتا ہے۔ اس کی تربیت اور اس کی اردگرد کی دُنیا رکاوٹیں پیدا کرتی ہے یہ کش مکش ساری عمر چلتی رہتی ہے۔ اور یہ بات اقتباس کے ایک ایک فقرے سے عیاں ہے :

> "میرے سامنے مسئلہ اپنی ماں کی رشتہ دار زینب کا تھا جو میرے جانے کے بعد گھر میں بالکل اکیلی تھی۔ اس کے باوجود میں اپنا سفر ملتوی کرنے کے لئے

تیار نہیں تھا۔ میں نے اسے گھر کے اخراجات کے لئے مناسب پیسے دے دیئے اور اپنی بہن کوئی اطلاع دی کہ وہ ہفتے میں ایک دو چکر لگا جایا کرے۔ میری بہن میرے اس منصوبے پر ہکی بکی رہ گئی۔ اگرچہ وہ عمر میں مجھے سے بڑی تھی لیکن میرے مزاج کے پیش نظر خاموش رہی۔ میں نے کئی مرتبہ سوچا ہے کہ خون کے رشتے کیا ہوتے ہیں؟ ایک خاندان کے افراد کے سال ایک چھت کے نیچے رہ کر بکھر جاتے ہیں۔ اگر وہ ایک دوسرے سے تعلق نہ رکھیں تو وہ خون کا نام نہاد رشتہ مدہم ہو جاتا ہے۔ شادی کے بعد میں اپنی بہن سے شاذ و نادر ہی ملا تھا، ہم دونوں نے ملاقات کی ضرورت محسوس نہ کی۔"
(۱۱)

آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان اقتباسات میں افراد کی ایک دوسرے سے لاتعلقی اور نتیجے میں پیدا ہونے والی انفرادیت غالب جہت کے طور مجبور ہے، چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انیس ناگی کی فکر میں اکیلا رہنا بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کی رقم کردہ کہانیوں میں ایک انسان دوسرے کا تضاد ثابت ہوا ہے اور یگانگت کی بجائے قیادت کی حدود متعین ہوئی ہیں۔ اس ضمن میں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ وجودی شخص کبھی کبھی انفرادی مفادات کی بجائے اجتماعی مفادت کو ترجیح دیتا ہے، تاہم اُس کی اجتماعی سوچ میں بھی انفرادی اغراض مضمر ہوتی ہے۔ اس کا مرکز صرف اپنی ذات ہوتی ہے جس کے گرد چکر کانٹے کاٹتے وہ کئی بار وسیع دائرے میں چلا جاتا ہے اور وہاں سے مطلب نکلنے کے بعد واپسی میں دیر نہیں کرتا۔

انیس ناگی کا افسانوی ادب فکر کے ساتھ ساتھ فنی سطح پر بھی دل چسپ رنگوں سے عبارت ہے۔ اس سلسلے میں اُنھوں نے جدید تر فنی حربوں مثلاً شعور کی رو، فلیش بیک، ڈائری رائٹنگ اور افسانہ در افسانہ سے کام لے کر ایک بڑا کہانی کار ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ تاہم یہ نکتہ اپنی جگہ اہم ہے کہ انیس ناگی شعور کی رو کے استعمال میں کہیں کہیں حد اعتدال سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ ان ضمن میں وہ ناول، ناولٹ اور افسانے دیکھے جا سکتے ہیں۔ "دیوار کے پیچھے"، "میں اور وہ"، "چوہوں کی کہانی"، "سکریپ بک"، اور "زرد ھواں" وغیرہ جو انھوں نے بلاواسطہ داخلی کلام کے تحت لکھے ہیں۔

د۔ انیس ناگی: سوانح اور ادبی احوال

انیس ناگی ۱۱ فروری ۱۹۳۹ء بروز جمعتہ المبارک اور بقر عید، شیخوپورہ (اُس وقت ضلع لاہور) میں پیدا ہوئے۔ اسکول میں ان کی تاریخ پیدائش مارچ ۱۹۴۰ء لکھوائی گئی تھی جو تعلیمی اسناد کا بھی حصہ ہے مگر یہ تاریخ اسکول میں داخلے کے وقت عمر کی قید کا نتیجہ تھی۔ پس اول الذکر ہی کو اصل ماننا چاہیے۔ اپنی پیدائش کی بابت انیس ناگی کچھ یوں لکھتے ہیں:

> "دونوں نیک دن ہیں لیکن کہا جاتا ہے کہ ان دونوں مبارک دنوں کا یک جا ہونا درست نہیں، جو اس دن بادشاہ بنے یا جنم لے اس کا مقدر زوال ہوتا ہے۔ میں بادشاہوں کے بارے میں تو نہیں جانتا لیکن اپنے بارے میں پتہ ہے کہ میں نے نہایت مشکل زندگی گزاری ہے جس میں راحت اور خوش قسمتی کا دور دور تک نشان نہیں ملا، اس لیے میں اپنی سرگزشت کو زوال کی کہانی کہوں گا۔" (۱۲)

انیس ناگی کے والد کا نام مولوی محمد ابراہیم تھا جو مسلک کے اعتبار سے وہابی تھے۔ وہ مذہب کو عقل سے پرکھتے تھے۔ دنیاداری کے ساتھ ساتھ انھیں قرآن کی تلاوت اور مذہبی کتابوں کے مطالعے کا شغف تھا۔ اُنھوں نے ایک چھوٹا سا کتابچہ "قرآن کیوں اُترا" اور ایک پمفلٹ "حجر اسود" شائع کروا کر لائل پور (موجودہ فیصل آباد) میں تقسیم کیا۔ مولوی محمد ابراہیم کو ہندوؤں کے مقدس پودے تلسی سے بھی خاص دلچسپی تھی۔ ایک عمر میں پیری فقیری کی جانب بھی مائل رہے اور دم دُرود سے خلق خدا کو فیض پہنچانے کی کوشش کی۔ مولوی ابراہیم نے تین شادیاں کیں۔ انیس ناگی کی والدہ سارہ بیگم ان کی تیسری بیوی تھیں۔

انیس ناگی کی والدہ ایک سیدھی سادھی ناخواندہ عورت تھیں جو عمر میں اپنے شوہر سے کافی چھوٹی تھیں۔ انھوں نے نہایت صبر اور اطاعت کے ساتھ زندگی بسر کی۔ وہ تین سوتیلے بیٹوں اور دو سوتیلی بیٹیوں کی موجودگی میں اپنی اولاد کے لیے بھی ایک معمہ ہی رہیں بقول انیس ناگی:

> "میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ میری ماں نے ایسی جگہ شادی کرنا کیوں قبول کیا جہاں اسے انصاف نہیں مل سکتا۔" (۱۳)

انیس ناگی کا بچپن پانچ چھے شہروں میں بکھرا ہوا ہے۔ ان کی یادداشت کا عمل سیالکوٹ شہر سے شروع ہوتا ہے جو ان دنوں ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ وہ زمانہ بہت سستا تھا۔ اس وقت کوڑیاں بھی پاتی تھیں اور تانبے کے

سکے بھی، جو بہت مضبوط سمجھے جاتے تھے۔ سکوں کا بادشاہ چاندی کا روپیہ تھا جس پر انگریزی بادشاہ کی تصویر کھدی ہوئی ہیں اور وہ ایک بڑا سکہ تصور کیا جاتا تھا۔ اسکول جانے سے قبل کے دور میں انیس کا سارا وقت گھر میں گزرتا۔ماں اپنی مصروفیات کے باعث ان سے لاتعلق نہیں،لہذا وہ اپنا تمام وقت ملازموں میں بسر کرتے۔ گھر میں بھائی بہنوں کی موجودگی کے باوجود میں سب سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ ان کا کچھ وقت اپنے بڑے بھائی کے ساتھ بھی بسر ہوتا، تاہم دونوں کے درمیان کوئی رشتہ یگانگت تعلیم اُستوار نہ ہو سکا۔

تعلیم و تربیت:

انیس ناگی کی تعلیم کا آغاز روہتک میں قیام کے دوران میں ہوا جب انھیں ان کی بڑی بہن کے ساتھ لڑکیوں کے اسکول میں داخل کرایا گیا۔ اپنے ساتھ اتنی لڑکیاں دیکھ کر وہ بے حد شرماتے اور دن بھر سہمے رہتے۔ وہ اسکول میں ایک عیسائی استانی مس متمائی سے بے حد خوفزدہ رہتے کیوں کہ وہ بچوں کو رولر سے مارتی تھیں۔ جس گھر اور ماحول میں ان کی پرورش ہوئی اور جیسا ان کا مزاج تھا۔یہی ادب کی دنیا اور کتابوں کا انبار ہی ان کے لیے مستقل اور محفوظ پناہ گاہ تھی ۔ غلام حسین ساجد نے بھی اپنے ایک مضمون میں ان کی کتاب دوستی کا اعتراف ان الفاظ میں کیا:

"انیس ناگی ایک جنونی ادیب تھے جن کی زندگی کا بنیادی حوالہ کتاب تھی۔ وہ کتابوں سے بیزار ہو کر بھی کتابوں کے درمیان رہتے تھے اس لیے کہ ان کی زندگی اور موت میں بنیادی کردار کتاب ہی کا رہا۔"[۱۴]

روہتک کے بعد مولوی ابراہیم (انیس ناگی کے والد) کا تبادلہ لائل پور (موجودہ فیصل آباد ہو گیا جو سکھوں کا قدیم شہر تھا۔ یہاں انھیں اور ان کے بڑے بھائی کے لیے اتالیق کا بندوبست کیا گیا جو تیسرے پہر گھر آ کر پڑھاتے تھے ۔ انیس ناگی اور ان کا بھائی پڑھنے سے زیادہ اپنے استاد کو تنگ کرتے تھے ، تاہم استاد صاحب بُرا نہ مانتے۔ وہ یہ کہ ایک جج کے بچوں کو ڈانٹ کر وہ اپنی روزی پر لات نہیں مارنا چاہتے تھے۔ انیس ناگی پانچ برس کو پہنچے تھے کہ مولوی محمد ابراہیم کا تبادلہ لائل پور سے لدھیانہ میں ہو گیا۔ یہاں انیس کی تعلیم کو سنجیدگی سے لیا جانے لگا۔ انیس اپنی لدھیانہ میں تعلیم کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"لدھیانے میں مجھے اسکول میں داخل کر دیا گیا لیکن میں اسکول میں سب سے سہما سہا رہتا اور ہم جماعتوں سے بہت کم بات کرتا لڑکے بھی مجھ سے ملنے سے کچھ گریز کرتے کہ میں ایک افسر کا بیٹا تھا۔ اس کے زیادہ قریب نہیں جانا چاہیے ۔ دوسری طرف

اسلامی اسکول کے مسلمان لڑکے بھی غریب طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے لیے
سول لائن میں مجھ سے کھیلنے یا ملنے آنا دشوار تھا۔ اسکول میں مجھے کھیلنے کا موقع بھی نہ ملتا
کیونکہ اسکول میں داخل ہونے سے پہلے ہی پیادہ سائیکل لیے بابر منتظر ہوتا اور اس نے
میرے علاوہ میرے بڑے بھائی کو بھی سائیکل پر لاد کر لے جانا ہوتا تھا۔" (۱۵)

ان دنوں پاکستان کے قیام کی تحریک زوروں پر تھی۔ ہر جگہ پاکستان کے چرچے تھے۔ چنانچہ مسلمانوں نے فیصلہ کیا کہ ان کے بچے سرکاری اسکولوں کی بجائے ان کے اپنے قائم کردہ اسلامیہ اسکولوں میں تعلیم حاصل کریں۔ مولوی محمد ابراہیم (انیس ناگی کے والد) نے بھی اپنے بیٹوں کو اسی نقطہ نظر کے تحت اسلامیہ اسکول میں داخل کرایا تھا، حالاں کہ شہر میں اس سے بہتر اسکول بھی تھے۔ انیس ناگی کے لیے اسکول جانا جبری مشقت سے کم نہ تھا۔ وہ اُس دور کی اپنی کیفیت یوں بیان کرتے ہیں:

"میں اسکول بالکل نہیں جانا چاہتا تھا، اس کی وجہ مجھے معلوم نہیں تھی۔
اسکول جانے سے پہلے میں ضد کرتا، میری ماں مجھے سمجھاتی، والد کا خوف
دلاتی اور میں بادل نخواستہ ریں ریں کرتا ہوا تیار ہوتا۔ کلاس میں ماسٹر جو کچھ
پڑھاتا میری سمجھ میں کچھ نہ آتا، اس لیے کہ مجھے بنیادی تعلیم نہیں دی گئی
تھی اور یک لخت اسکول میں داخل کروادیا گیا تھا میں چپ کر کے کلاس میں
بیٹھا رہتا اور دوپہر کے لیے میری ماں نے جو آملیٹ اور پراٹھا میرے بستے
میں رکھا ہوتا، میں اس کے چھوٹے چھوٹے لقمے بنا کر اس طرح کھاتا کہ ماسٹر
کو پتہ نہ چلتا اور میں اثبات میں سر ہلا ہلا کر ماسٹر کو یقین دلاتا کہ جو کچھ وہ پڑھا
رہا ہے وہ میری سمجھ میں آرہا ہے۔" (۱۶)

لائل پور میں ایک ادھیڑ عمر انگریز جوڑا انیس ناگی کو گود لینا چاہتا تھا۔ یہ انگریز سیشن جج مولوی محمد ابراہیم کا افسر تھا۔ یہ معاملہ انیس ناگی کی والدہ کے آڑے آنے سے ٹل گیا۔ جس کا انیس ناگی کو زندگی بھر افسوس رہا۔ انیس ناگی کی شدید خواہش تھی کہ انگریز جوڑا انھیں گود لے لیتا اور وہ عمر بھر عیش کرتے۔ لدھیانہ کے اسلامیہ اسکول میں داخلے کے کچھ عرصے بعد انیس ناگی کے والد کا تبادلہ جالندھر ہو گیا جہاں سول لائن کا علاقہ شہر سے بہت دور تھا۔ یہاں ایک اتالیق کے ذریعے انیس ناگی کی تعلیم کا بندوبست کیا گیا اور چند دنوں بعد انھیں گورنمنٹ ہائی اسکول جالندھر میں داخل کرادیا گیا۔ اس سلسلے میں انیس ناگی لکھتے ہیں:

"ہماری کوٹھی کے عقب میں ایک کافی بڑا میدان تھا جسے عبور کر کے ایک پختہ سڑک تھی جس کے پہلو میں گورنمنٹ ہائی سکول جالندھر کی سرخ اینٹوں کی عمارت کھڑی تھی۔ میں کس طرح اس سکول میں داخل ہوا مجھے کچھ علم نہیں۔ بدنی ساخت کے اعتبار سے بھی میرا ڈھانچہ اوسط درجے کا تھا جو خون پیدا کر سکتا تھا اور نہ ہمدردی۔ پتہ نہیں مجھے کس کلاس میں داخل کرایا گیا تھا کیونکہ ماسٹر جو کچھ پڑھاتا میری سمجھ میں کچھ نہ آتا۔ میں سارا دن سر جھکا بنچ پر بیٹھا رہتا۔ کبھی کبھار کنکھیوں سے اپنے ہم جماعتوں کو دیکھتا جو میری طرف دیکھ رہے ہوتے۔"(۱۷)

انیس ناگی نے کالج کے زمانے میں روسی تحریروں کے ساتھ ساتھ فرانسیسی ادب کا مطالعہ بھی کیا۔ اس زمانے میں ناولوں کے نسائی کردار کی چشم تصور سے نکل کر انہیں سپنوں میں مبتلا کرنے لگے تھے۔ ان دنوں قیوم نظر پاک ٹی ہاؤس اور حلقہ ارباب ذوق کے بے تاج بادشاہ تھے۔ اور اپنے آپ کو میراجی کے قریبی دوستوں میں شمار کرتے تھے۔ انھوں نے انیس ناگی کی نئی شاعری اور جارحانہ تنقید کا نوٹس لیتے ہوئے گورنمنٹ کالج میں منٹو اور پروفیسر جی۔ ایم اثر کی کہانیوں کو مبالغہ آمیز طریقے سے شہرت دینے پر انیس ناگی اور دوسرے طلبا کو حکومت دشمن قرار دینے میں اہم کردار ادا کیا۔

انیس ناگی نے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا تو والد کے اصرار پر ایم۔ اے ہسٹری میں داخلہ لے لیا۔ انیس ناگی کو اس مضمون میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ انھوں نے ایف۔ اے اور بی۔ اے میں یہ مضمون نہیں پڑھا تھا اور دوسری یہ کہ چند دن لیکچر لے کر ان کی طبیعت اُچاٹ ہو گئی۔ اس میں جب پروفیسر ہسٹوِر ایرانی پیپر دے رہے ہوتے تو انیس " بالزاک اور اولڈ گوریو" کا مطالعہ کر رہے ہوتے۔ آخر انھوں نے ایک دن ہسٹری چھوڑ کر پنجاب یونیورٹی میں ایم اے اردو میں داخلہ لے لیا۔ یہاں انیس ناگی اپنی اولین محبت میں مبتلا ہوئے لیکن لڑکی کی اسلام پسندی اور انیس کی نفسیات پسندی کی وجہ سے دونوں میں نبھ نہ سکی۔ اس سلسلے میں انیس ناگی کا موقف تھا۔

"ایک دن مجھے اس نے پیسے دیے اور اس کے ساتھ تلقین بھی کی کہ میں ان پیسوں کے ساتھ آج ہی نور اسلام فلم دیکھوں۔ میں اس لڑکی کی نفسیاتی ساخت پر غور کرنے لگا کہ وہ ایک مسلمان کو دوبارہ مسلمان کیوں کرنا چاہتی

ہے اور یہ کہ مذہبی جذبات کو ان کے ساتھ کیا تعلق ہے ؟ میں ذہنی طور پر
کسی اور دنیا کا باشندہ تھا اور اتنی قدامت پرست اور ظاہری طور پر مذہبی لڑکی
سے جذباتی طور چلنا میرے لیے مشکل تھا۔" (۱۸)

اس دورانیے میں انیس ناگی کے دل و دماغ پر ایک نامعلوم ابہام چھانے لگا۔ شام ہوئی تو کندھوں میں ایک تناؤ پیدا ہو جاتا جو سرکتا ہوا دماغ کے مختلف گوشوں میں پھیل جاتا۔ دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی کیوں کہ انہیں زندگی میں جو پہلی لڑکی ملی، اس نے ان کا زندگی کا تصور چکنا چور کر دیا تھا۔ انیس ناگی زندگی میں نیا راستہ چاہتے تھے۔ انھیں اپنے والد کی حالت پر رحم آتا تھا کہ ہر محاذ پر شکست کے باوجود انھوں نے اپنی ظاہری شبیہ کو ٹوٹے نہ دیا تھا۔ ان کی محکمانہ ترقیاں روکی گئی تھیں۔ ان پر جھوٹی انکوائریاں نافذ کی گئی تھیں، وکالت کا لائسنس منسوخ کر دیا گیا تھا، امرتسر کے مکان جلائے گئے تھے۔ کوئی بینک بیلنس نہ بن سکا تھا اور اولاد باغی ہو گئی تھی۔ خانگی زندگی بگڑ گئی تھی اور مستقبل تاریک ہو گیا تھا۔ ان سارے حقائق کے باوجود وہ شکست ماننے کے لیے تیار نہیں تھے یا پھر وہ اتنے بزدل ہو گئے تھے کہ ان واقعات کے خلاف ردعمل ظاہر نہیں کر سکتے تھے۔ ادھر انیس ناگی کے ہاں ان واقعات نے ردعمل پیدا کیا تھا۔ وہ اکثر سوچتے کہ سوچنا بے کار ہے، یہ ایک نشہ ہے جو عمل کی صلاحیت سلب کر لیتا ہے۔ ان کی یہ کیفیت ان کے زیادہ سوچنے کا سبب بن گئی تھی۔

شخصیت:

انیس ناگی کی شخصیت کی تعمیر و تربیت میں اُن کے گھریلو ماحول کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اُن کے والد مولوی محمد ابرہیم ایک سرکاری ملازم تھے اور ملازمت کے سلسلے میں اُنھیں مختلف شہروں میں آباد رہنا پڑتا تھا۔ مولوی محمد ابراہیم کی نوکری کے سبب اُن کی اولاد معاشی طور پر تو خوشحال رہی مگر روز روز کے تبادلوں اور عوام الناس سے دور سرکاری رہائش گاہوں میں قیام کی وجہ سے وہ معاشرتی آداب اور سماجی اقدار سے بڑی حد تک محروم رہی۔ جہاں تک انیس ناگی کا معاملہ ہے وہ دیگر بہن بھائیوں سے زیادہ حساس واقع ہوئے تھے۔ چنانچہ بچپن ہی میں وہ عدم اعتماد اور احساس کمتری میں مبتلا ہو گئے تھے۔ المیہ یہ تھا کہ اُن کے والد سرکاری ذمے داریوں میں محویت کے سبب اُنھیں مناسب وقت اور توجہ نہیں دے پا رہے تھے۔

وہ معاشی استحکام کی خاطر اپنے بچوں کو پدری شفقتوں سے محروم رکھے ہوئے تھے۔ احساسات کی تسکین سے بے خبر وہ محض روٹی کپڑے کی فراہمی اور اعلیٰ تعلیمی اداروں میں تعلیم ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے تھے۔ پھر وہ طبعاً سخت مزاج تھے۔ معمولی معمولی باتوں پر مشتعل ہو کر ہنگامہ برپا کر دینا اُن کا عام دستور تھا۔

اُن کی سخت گیر طبیعت کو دیکھ دیکھ کر انیس ناگی بھی آدم بیزار ہو گئے تھے۔ غصہ، نفرت، حقارت اور عدوات اُن کی گھٹی میں پڑ گئے تھے۔ خود سیر فطرت ثانیہ بن گئی تھی۔ پس وہ بقیہ عمر میں بھی ان مکر وہ اوصاف سے پیچھا نہ چھڑا سکے۔ اور اسی طرح مارشل لاء کی وجہ سے نگرانی کا خوف سر پر منڈلانے لگا جس سے انیس ناگی نے بے انتہا پریشانیاں اور مصیبتیں اٹھائیں اور ان کی شخصیت persecution mania کا شکار ہو گئی۔ انہوں نے خود کو کم گو اور محدود رکھا لیکن نارسائی، خوف، تشنگی، انکار اور تنہائی کے شعلوں نے اپنی لپیٹ میں لیا اور اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ کتابیں اور مطالعہ ہی واحد زریعہ تھا جن کی بنا پر انیس ناگی کی زندگی کی عمارت قائم دائم تھی۔ وہ راں بو اور بودیر ادبی ادیبوں کو ہیرو ماننے لگے ان جیسی آزادانہ زندگی اور آزادروی کو ترسنے لگے مگر یہ سب بے ثمر ہی رہا لیکن ان کی تخلیق کے سرچشمے بہنے لگے اس سلسلے میں ڈاکٹر شاہین مفتی لکھتی ہیں:

> "باہر کی دنیا میری دنیا سے مختلف تھی۔ یہ تنہائی جیسی تشنگی اور ابہام کا جنگل تھا کہ میں ابھی تک اپنی شرح نہیں کر سکتا تھا میں نے محسوس کیا کہ میرے اندر منفی رویے پیدا ہونے لگے تھے، میں اپنے کمرے میں ٹہلتا، اپنے والد کی ناجائز سختی اور بے عزتی، مالی تشنگی، مستقبل کی تاریکی مجھے اتنا پریشان کرتے کہ میرا جی کرتا کہ میں اتنا نشہ کروں کہ سدھ ماری جائے۔" (۱۹)

انسان کی بچپن کی زندگی اس کی شخصیت پر بہت گہرے اثرات چھوڑتی ہے۔ اسی طرح انیس ناگی کے بچپن کی بہت سی باتیں ان کے دماغ کے لاشعوری حصے میں بیٹھ چکی تھیں۔

وفات:

انیس ناگی ۱۷ اکتوبر ۲۰۱۰ء بروز جمعرات کو پنجاب پبلک لائبریری، لاہور میں کمپیوٹر پر کام کر رہے تھے اچانک اُن کی طبیعت خراب ہوگئی۔ لائبریری کے عملے نے ایمبولینس کے ذریعے انہیں فوری طور پر ہسپتال منتقل کرنے کی کوشش کی لیکن وہ راستے ہی میں دم توڑ گئے۔ ڈاکٹروں کی رپورٹ کے مطابق ان کا انتقال دل کا دورہ پڑنے سے ہوا تھا۔ اس کے لئے ڈاکٹر دانیال ناگی کو بے چینی ہے کہ وہ موقع پر ہوتے تو شاید اپنے باپ کے پھیپھڑوں کو مناسب دباؤ سے متحرک کر سکتے یا پھر فوری طبی امداد سے انھیں موت کی وادی میں جانے سے روک لیتے لیکن یہ ایک بیٹے کی باپ سے محبت محض ایک سوچ ہے۔ سچ یہ ہے کہ دانیال ہوتے بھی تو کچھ نہ کر سکتے۔ قسمت کے سامنے سب بے بس ہیں۔ یہاں عقل اور مہارت کام نہیں دیتی۔ انیس ناگی کی رحلت پر نامور ادیبوں، مصنفین شعرا، ادبی تنظیموں نے گہرے رنج، دکھ اور ملال کا اظہار کیا اخبارات ادبی

رسائل و جرادان کی فن اور عظمت پر مضامین تحریر کیے گئے ان کے نظریات اور کتاب دوستی پر اخباروں میں لفظوں کے انبار انڈیلے گئے ان کی وفات پر اردو کے معروف ادیب انتظار حسین نے لکھا ہے:

"As for Anis Nagi,he stands distinguished for his deep devotion to literature and to literary cause,he belived in.He stuck to his guns till the last moment in his life and kept his anger alive throughout his deep literary struggle.He lived as angry young man and also died as one".(20)

چنانچہ انیس ناگی کو جنازے کے بعد علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور کے رضا بلاک کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ پس ماندگان میں اُن کی اہلیہ عفت انیس، بیٹی کومل اور بیٹا دانیال ناگی شامل ہیں۔ وفات سے ایک روز قبل انیس ناگی نے درجِ ذیل نظم کہی تھی۔

ایک نظم

وہ جو کرسی پر بیٹھا تھا
اب قبر میں لیٹا ہے
وہ جو بے خوابی کے عالم میں رہتا تھا
خود اک ایسا خواب بنا ہے
جس کو شاید کوئی دیکھے!

تصانیف:

ناول نگاری

ا۔ دیوار کے پیچھے	۱۹۸۰ء
۲۔ میں اور وہ	۱۸۷۳ء
3۔ زوال	۱۹۸۹ء
۴۔ ایک گرم موسم کی کہانی	۱۹۹۰ء
۵۔ ایک لمحہ سوچ کا	۱۹۹۱ء
۶۔ محاصرہ	۱۹۹۲ء

۷۔ قلعہ ۱۹۹۴ء

۸۔ چوہوں کی کہانی ۱۹۹۵ء

۹۔ کیمپ ۱۹۹۸ء

۱۰۔ پتلیاں ۲۰۰۳ء

۱۱۔ ناراض عورتیں ۲۰۰۴ء

۱۲۔ ۳۱۳بریگیڈ ۲۰۰۷ء

۱۳۔ صاحبان ۲۰۱۰ء

۱۴۔ سکریپ بک ۲۰۰۹ء

۱۵۔ فصلیں (مجموعہ چار ناول: قلعہ، چوہوں کی کہانی، کیمپ، ایک گرم موسم کی کہانی)

افسانہ نگاری:

- حکایات ۱۹۸۲ء
- گردش ۱۹۸۸ء
- وقت کی کہانیاں ۱۹۸۸ء
- نئے افسانے کی کہانی ۲۰۰۸ء

ترجمہ نگاری:

- سسفیس کی کہانی (فلسفہ)، البیر کامیو (فرانسیسی ادب)
- طاعون ناول، البیر کامیو (فرانسیسی ادب)
- کایا کلپ افسانہ، فرانز کافکا انگریزی سے ترجمہ

تہہ خانے ناول، فیودر دوستوئفسکی روہی ادب انگریزی میں ترجمہ

شعری تراجم:

- جہنم میں ایک موسم، آرتھر راں بو فرانسیسی ادب
- ہوائیں، سنیٹ جان پرس فرانسیسی ادب
- جلاوطنی دوسری نظمیں، سنیٹ جان پرس

- ٹی ایس ایلیٹ کی نظمیں، انگریزی ادب
- پابلو نیرودا کی نظمیں
- جدید فرانسیسی ادب
- میراجی ایک بھٹکا ہوا شاعر
- نئے افسانے کی کہانی
- تشکیلات
- افتخار جالب
- بلھے شاہ شخصیت اور شاعری

شاعری

- بشارت کی رات
- غیر ممنوعہ نظمیں
- نوحے
- زور آسمان
- روشنیاں
- بے خوابی کی نظمیں
- آگ ہی آگ
- ابھی کچھ اور
- بے خیالی میں
- صداؤں کا جہاں
- بیابانی کا دن
- درخت میرے وجود کا
- بیگانی کی نظمیں
- جنم ایک اندھی

تاریخ، ثقافت اور نفسیات

- ❖ انارکلی حقیقت یارومان
- ❖ عمومی نفسیات
- ❖ لاہور جو شہر تھا
- ❖ جنس اور وجود
- ❖ پاکستانی اردو ادب کی تاریخ

سوانح حیات:

1. ایک ادھوری سرگزشت
2. ادارت
3. مدیر سہ ماہی دانشور

کالم نگاری

1. پاکستان ٹائمز
2. نیشن
3. فرنٹیئر پوسٹ
4. انڈیپنڈنٹ ویکلی
5. جنگ
6. دی نیوز

ر۔ اُردو ناولوں میں وجودیت کی روایت

جن جدید اردو ناول نگاروں کے ہاں وجودیت کا فلسفہ یا وجودی نقطہ نظر پایا جاتا ہے۔ ان میں سب سے معروف نام قرۃ العین حیدر کا ہے۔ اس حوالے سے ان کا نمائندہ ناول " آگ کا دریا " ہے۔ قرۃ العین حیدر کا یہ ناول انسانی وجود کے مسائل کو زیر بحث لاتا ہے۔ ناول کے کردار اضطراب اور بے چینی کا شکار میں دووقت کے تغیر و تبدل کے ہاتھوں فنا کے راستے پر گامزن ہیں۔ انفرادی اور اجتماعی سطح پر دہشت اور کرب کا شکار ہیں، تمام کردار گوتم نیلمبر، ہری شنکر کسی نہ کسی کرب کے ہاتھوں اذیت ناکی کی حیات میں رہے ہیں۔ اس کے

علاوہ تمام کردار اس ناول کا موضوع ہیں۔ یہ موضوع ہر دور میں موضوع بحث رہا۔ بدھ نے بھی انسانی وجود اور اس کے مسائل کو موضوع بحث بنایا تھا۔ "آگ کا دریا" میں وجودی مباحث کے دو عوامل زیادہ کار فرما ہیں، پہلا وقت اور انسانی وجود کی اس میں شرکت اور دوسرا درندگی کا انجام یعنی فنا کے پار اتر جاتا۔ اور انسانی نسل کی مسلسل بقا بھی اس ناول کا مرکزی خیال ہے۔ جس طرح کامیو نے اپنی تصنیف "سسفیس کی کہانی" میں خود کشی کے موضوع کو فلسفیانہ رنگ دے کر پیش کیا۔ اس طرح قراۃالعین حیدر نے بھی ناول میں فرد کے مسائل وجود کے کرب اور دہشت ناکی کے علاوہ وقت کے ساتھ ان کا رشتہ جوڑ کر وجودی مباحث کو تقویت دی ہے "آگ کا دریا" کے علاوہ بھی ان کی تصنیف کردش رنگ چمن میں بھی وجودی مسائل کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔
معاصر اردو ناول نگاروں کے ہاں قرۃالعین حیدر کے علاوہ جس ادیب نے وجوی مسائل کو اپنے ناولوں کا جزو بنایاان میں انتظار حسین کا نام بھی بے حد اہمیت کا حامل ہے ان کے ناولوں میں چاند گہن، بستی، آگے سمندر ہے ، میں تقسیم، تجارت اور اپنی جڑوں سے جڑ جانے کا ذکر بڑے ملال کے ساتھ اس کا بار بار تذکرہ ملتا ہے۔ ہجرت کے سائے اور اس سے پیدا شدہ دکھ اور کرب الم ناک صورت حال ہے۔ انتظار حسین کے ناولوں میں ان کے کرداروں نے ہجرت کے کرب کو اپنی روح پر جھیلا۔ بلکہ وہ اس کرب کو خوف اور دہشت میں ،ملفوف اپنی ذات سے لپٹا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ یہ ہجرت کا المیہ، خوف، باطنی انتشار اور کرب انہیں ایک وجودی کردار بناتے ہیں۔ ان کے ناول "بستی" میں مشرقی پاکستان کی تقسیم کا المیہ بھی خوف کو جنم دیتا ہے۔ اور جب اس غم میں ہجرت اور فسادات کا غم شامل ہو تا ہے تو کرب مزید ازیت ناک صورت اختیار کر لیتا ہے۔
اس حوالے سے ڈاکٹر ممتاز احمد خان لکھتے ہیں:

> "بستی میں وہ تمام مسائل ہیں جو صدیوں سے چلے آ رہے ہیں جنگ، تقسیم، ہجرت اور تاریخ اور ان سب کو ملا کر وقت کی ستم گری "بستی" میں نظر آتی ہے۔" (۲۱)

انتظار حسین کے بعد جس ناول نگار کے ہاں وجودی مسائل پائے جاتے ہیں ان میں عبد اللہ حسین کا نام کافی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کے تمام ناولوں "اداس نسلیں"، "باگھ"، "قید"، "نشیب" میں انہیں مباحث کو موضوع بنایا گیا ہے۔
"اداس نسلیں" میں موت اور فنا کا جو احساس پورے ناول پر چھایا ہوا ہے اسے وجودی ناول بنانے میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ ویسے بھی موت کا تصور وجودیت کافی اہمیت رکھتا ہے، وجودیت میں موت ایک

انفرادی اور موضوعی حقیقت کے طور پر سامنے آتی ہے۔ جب برصغیر میں تقسیم ہوتی ہے تو اس وقت فسادات اور ہجرت کے دوران جس وسیع پیمانے پر موت رقصاں نظر آتی ہے۔

"باگھ" بھی وجودی مسائل کے مباحث کو تقویت دیتا ہے۔ فوجی آمروں کے ہاتھوں اور خوف زدہ کئے گئے پاکستانی حریت پسندوں کی داستان غم ہے۔ ان کی روحیں ازیتیں جھیل جھیل کر فنا ہو چکی ہیں اور آخر میں تنہائی کے باعث موت کی آغوش میں سانسیں لینے پر مجبور ہیں۔ قید بھی اسی موضوع کو آگے بڑھاتا ہے۔ نائی کی قید، استحصالی قوتوں کی قید ضمیر کی قید اور سب سے بڑھ کر جان لیوا تنہائی کی قید کرداروں کی شکست و ریخت کا سبب بن جاتی ہے۔ عبد اللہ حسین کے ہاں جبر اور جلا وطنی، انسانیت کی موجودگی کرداروں کو وجودی بناتی ہے۔ عبد اللہ حسین کے علاوہ انور سجاد کا ناول "سنگ" کا موضوع انسان کی ازلی اور ابدی تنہائی ہے۔ تنہائی اس ناول کے کرداروں کو بے مقصد اور لایعنی زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ خوشیوں کا باغ میں بھی، اضطراب، تشویش، بے مقصدیت، لاحاصل جدوجہد، بے ثمر زندگی اور مقدر کی ستم ظریفی ان کے کرداروں کے مسائل ہیں۔

ان کے ناولوں پر مغربی وجودی مفکرین، کامیو اور سارتر کے اثرات بہت واضح نظر آتے ہیں۔ ہم انھی کے ناول " جنم کنڈلی" بھی ایک عہد کی تہذیب اور فرد کے مسائل، خوف، ناآسودہ زندگی، بے چینی انتشار، یاسیت اور فرسودگی کو بیان کرتا ہے۔ جنم کنڈلی " پر سارتر کے افکار کی نمایاں چھاپ ہے۔ اس ناول کا ہیرو سارتر کے ناول متلی کے ہیرو سے بے حد مشابہت رکھتا ہے۔ جنم کنڈلی'' میں متلی کی کیفیت کو خاص اہمیت دی گئی ہے، سارتر کے ہیرو کی طرح "جنم کنڈلی" کا ہیرو بھی مرگی کا مریض ہے اور مرگی بذات خود لایعنیت اور بے معنویت کی علامت تصور کی جاتی ہے۔ ان ناول نگاروں کے علاوہ جس مصنف کے ہاں وجودیت کی باقاعدہ اصطلاحوں کو ناول میں سمویا گیا ان میں نثار عزیز بٹ کا نام بہت نمایاں ہے۔ ان کے ناول "کاروان وجود" میں باقاعدہ وجودی فلسفہ اور اس سے وابستہ اصطلاحات بھی استعمال کی گئی۔

مستنصر حسین تارڑ کے ناول'' راکھ "، "اے غزال شب" اور "خس وخاشاک زمانے" کے کردار بھی وجودی مسائل کا احاطہ کرتے ہیں۔ "راکھ" قوموں کے زوال کی علامت ہے۔ زوال اور فنا کے راستے پر کردار گامزن ہیں۔ بربادی کا زہر ان کی نس نس میں اتر چکا ہے۔ بے چینی اور بے اطمینانی کا زہر ان کی زندگیوں کو دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے۔ خس وخاشاک زمانے میں وقت کے ہاتھوں قتل ہونے کو موضوع بنایا گیا ہے، بے چینی اور اضطراب اس ناول کے کرداروں کا خاصہ ہے، تاریخ کا جبر بھی اس ناول میں نظر آتا ہے۔ یہ

تاریخی جبریت اور وقت کا احساس وجوی قلق کی دین ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کے بعد جس ناول نگار کے ہاں وجودی مسائل نظر آتے ہیں۔ وہ فاروق خالد ہیں۔ فاروق خالد کا ناول " سایہ " ایسی صورت کو پیش کرتا ہے جس میں عام انسانوں کی زندگیاں تاریکی کے سایوں کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں گزرتی ہیں۔ ان کی باطنی ٹوٹ پھوٹ اور بے معنویت کا احساس تو ان کو کھائے جارہا ہے، اس ناول کے تمام کردار متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، غربت، بے بسی، لاچاری اور تنگدستی کا زہر ان کی رگوں میں پھیل چکا ہے جو لا علاج ہے اور تمام کوششوں کے باوجود لاحاصل اور بے ثمر ہیں۔ اردو ناول کی تاریخ میں انیس ناگی کا نام انتہائی معتبر ہے۔

ان کا پہلا ناول "دیوار کے پیچھے" انحراف اور بغاوت کی مثال بن کر سامنے آیا، انہوں نے فرد کے ٹھوس مسائل اور وجودی بحران کو ناولوں میں پیش کیا، ان کے ناول جدید عہد کے فرد کی داخلی اور خارجی زندگی کے احوال کا بھرپور عکس ہیں۔ انہوں نے روایت سے بغاوت کر کے اردو ناول کو منفرد اور نئے رجحانات سے روشناس کروایا۔ کسی نے ان کی ذاتی زندگی میں جھانکنے کی زحمت ہی نہ کی کہ انیس ناگی کیوں ہمیشہ ناراض رہتا ہے کہ ہر کوئی اپنی زات کے حصار میں قید تھا، کہ کسی کو خیال ہی نہ سوجھا کہ ایسا شخص کتنی محبت سے لبریز ہے؟ انیس ناگی کے بارے میں ان کے بیٹے دانیال لکھتے ہیں:

"ذاتی زندگی میں وہ ایک شفیق باپ، ایک اچھے شوہر اور بہت محبت کرنے والے انسان تھے۔" (۲۲)

ناول صاحبان میں انگریز انتظامیہ، ان کی چالاکیوں، مقامی لوگوں کی چاپلوسی اور غداری کو مرکزی اہمیت دے کر کہانی کا تانا بانا تیار کیا ہے۔ گورا سرکار کس طرح اپنے مفاد کا تحفظ کرنے کے لیے مقامی لوگوں کو استعمال کرتی ہے اس کا تزکرہ اس ناول میں جابجا ملتا ہے۔ مرکزی کردار جاوید خود تاریخ کے جبر کا شکار ہے۔ اس ناول کے بارے ڈاکٹر شیبا عالم لکھتی ہیں:

> "انیس ناگی کا ایک اور ناول "ایک گرم موسم کی کہانی" بھی 1857ء کی جنگ آزادی کی گونج میں لکھا گیا ہے اسے ہم انیس ناگی کے تاریخی شعور اور ان کے زہنی تناظر میں اہمیت کے ساتھ دیکھ سکتے ہیں یہ بھی مختصر ناول ہے اور اس میں پاکستان کے تناظر میں تاریخ کی بازیافت کو موضوع بنایا گیا ہے۔" (۲۳)

انیس ناگی کے ناول اس عہد کی سماجی دستاویز ہیں جن کا ہیرو داخلی اور خارجی سطح پر کرب اور بیگانگی سے دوچار ہے جس کے لیے جائے پناہ کوئی نہیں ان کے ناولوں کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ اردو ناول کی روایت سے ہٹ کے لکھے گئے ناول ہیں روایتی قصے، کہانیوں، عشق و محبت کے تزکروں سے تہی ناول فرد کے داخلی

کرب، بے چینی اور انتشار کو نمایاں کرتے ہیں زندگی کی تلخیاں، مشکلات اور ان میں گم کردہ کردار، ان کے ہاں نظر آتے ہیں، مختصر طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے ناول سیاسی، سماجی، وجودی اور تاریخی صورت حال کی منفرد اور مستند دستاویز ہیں۔ وجودیت پسند فلاسفر بنیادی طور پر فرد کی انفرادیت اور آزادی انتخاب کے قائل ہیں۔ لہٰذا کوئی بھی اپنے آپ کو کسی مخصوص حیطہ فکر سے جوڑ کر پابند اور اسیر نہیں کرنا چاہتا۔

حوالہ جات

1.Hazen,C.D,"Modern Europe(upto 1945)"S.Chand & Co. Dehli 1956 P.79

2.Hazen,C.D."Modern Europe(upto 1945)",P.101

3۔ سی۔اے قادر،ڈاکٹر،وجودیت، مشمولہ:ادب فلسفہ اور وجودیت،احسن نگارشات،۱۹۹۲ء،لاہور،ص۱۵۷

4۔ قاضی جاوید،بیس عظیم فلسفی،فکشن ہاؤس،لاہور، ۲۰۱۲ء،ص۱۴۴

5۔ بختیار حسین صدیقی 'وجودیت کیا ہے' مشمولہ: 'وجودیت' مرتبہ: جاوید اقبال ندیم ،ص۴۳

6۔ محمد جعفر تھانیسری ،مولانا،کالا پانی ،سنگ میل پبلیکیشنز ،لاہور، ۱۸۸۱ء ص۵۶،۵۷

7۔ حسن ریاض حسین، پاکستان ناگزیر تھا،شعبہ تصنیف و تالیف کراچی، یونیورسٹی کراچی، ۱۸۸۲ء ،ص۳۰ ۔۳۱

8.Azad,Abul Kalam "India Wins Freedom" Orient Longman Hyderabad (India) 1986 P-207

9۔ انیس ناگی،ڈاکٹر،ایک ادھوری سرگذشت،جمالیات،لاہور، ۲۰۰۸ء،ص۱۸

10۔ ایضاً،ص۱۸

11۔ ایضاً،ص۱۰

12۔ ایضاً،ص۱۲

13۔ ایضاً،ص۱۳

14۔ غلام حسین ساجد،مشمولہ: سہ ماہی دانشور،انیس ناگی نمبر،مدیر عفت انیس،(لاہور:بک ہوم،۲۰۱۱ء)،ص۸۱

15۔ ایضاً،ص۲۸

16۔ ایضاً،ص۵۶

17۔ ایضاً،ص۱۲۹۹

18۔ ایضاً، ص ۲۷

19۔ شاہین مفتی، ڈاکٹر، "انیس ناگی شخصیت و فن" اسلام آباد، اکادمی ادبیات، ۲۰۰۱ء، ص: ۱۸

20.Intazar Hussain,Dawn Books and Author,(Lahore,17 Oct 2010),P8

20.

21۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، آزادی کے بعد اردو ناول، ہیئت اسالیب، اور رجانات (۱۹۴۷ء۔۱۹۸۷ء)
،(کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۷ء)، ص ۲۴

22۔ دانیال ناگی، ڈاکٹر، میرے ابو جی، (مضمون)، مطبوعہ: راوی، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی
لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۱۴۷

23۔ شیبا عالم، ڈاکٹر، اردو کے نمائندہ ناول نگاروں کا تاریخی شعور، سنگ میل پبلی
کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۲۴

باب دوم

ناول "پتلیاں" کا موضوع: وجودی فکر کے تناظر میں تنقیدی جائزہ

وجودیت ایک ایسا فلسفہ ہے جو فرد کی انفرادیت اور استقامت پر زور دیتا ہے۔ جو فرد کو زندگی کے دھارے میں منفرد اور ممتاز بناتا ہے۔ وجودیت ہستی کا فلسفہ ہے۔ جس میں فرد کی آزادی، انتخاب اور ذمہ داری جیسے موضوعات شامل ہیں۔ وجودی کیفیات میں، لایعنیت، کرب، تشویش، جبریت، خوف، بیگانگی، مایوسی اور موت کی کیفیات کا ذکر اہمیت کا حامل ہے۔ جس کا اثر انسانی زندگی پر واضح دکھائی دیتا ہے۔

انسان دنیا کا ایک جزو نہیں بلکہ اس کے ساتھ منسلک ہے اور اس کا رشتہ ہمیشہ تناؤ اور کش مکش کا شکار رہتا ہے۔ ناول میں وجودیت کے حوالے سے ڈاکٹر سی اے قادر نے کہا ہے کہ:

> "پتلیاں کے کردار دوہری اذیت میں مبتلا ہیں وہ موجود پر قانع نہیں رہنا چاہتے اور اس کو بدلنے کی کوش بھی نہیں کرتے۔ وہ اپنے باطنی حصار کو توڑ کر وقت کے تیز دھارے میں اترنے کی خواہش بھی رکھتے ہیں۔ اور کسی جدل میں اترنے اور اپنے بے اعتبار اور بے بس ہوتے چلے جانے کی کیفیت سے آزاد ہونے پر آمادہ بھی نہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کا ظاہری تحریک انہیں موجود کے جبر اور حصار سے باہر لانے کی بجائے اس جال میں مزید الجھانے کا باعث بنتا ہے۔"(۱)

وجودیت کے حوالے سے مفکروں کے ہاں خاصا اختلاف رہا ہے یہ لفظ اتنی ساری چیزوں کیفیات اور رویوں کے بارے میں بولا گیا کہ اب یہ مہمل بن کر رہ گیا ہے لیکن پھر بھی اس کی اہمیت وافادیت ک، و نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ فرد کے داخلی رویوں اور خارجی حقیقت پر ایک لمبی چوڑی بحث وجودیت کا حصہ رہی پروفیسر بختیار حسین صدیقی نے وجودیت کی تفہیم کچھ اس طرح سے کی ہے۔

> "وجودیت وہ طرز فکر ہے، جو انسانی حقیقت کو سمجھنے کے لئے اس کی ترکیب کے ذہنی اور عقلی پہلوؤں کی بجائے جذبی پہلوؤں پر زیادہ توجہ دیتی ہے۔ عقل تجربہ اور کلیت کے چکر میں دور ہی سے حقیقت کو ہاتھ لگا کر نکل جاتی ہے، لیکن جذبہ وجود کے اندر گھس کر ہمیں دل کی گہرائیوں کا پتہ دیتا ہے۔ بعض جذبی کیفیات تو ایسی ہوتی ہیں جن کی حیثیت نفسیاتی کم اور

وجودی زیادہ ہوتی ہے وہ ان مسائل پر روشنی ڈالتی ہیں جن کا تعلق براہ راست انسان کی اصل حقیقت اور منزل مقصود سے ہوتا ہے۔ "[۲]

مختلف وجودی مفکرین کے ہاں یہ فلسفہ انسانی ہستی کی تفہیم و تشریح کا نام ہے فرد کی زندگی، تجربے، تاریخی صورت حال سب کچھ اس لفظ کے اندر چھپا ہوا ہے۔ وجود فرد کی ہستی کی تصدیق اور قبولیت کا فلسفہ ہے اور یہ فلسفہ بتاتا ہے کہ فرد اور دنیا کے اندر ایک کشمکش جنم لیتی ہے۔ انسان اپنے آپ سے دستبردار نہیں ہوتا وہ ہمیشہ زندگی گزارنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ اور یہ عمل عقل کی بجائے جذبے کے تحت ہوتا ہے۔ یوں کہا جاسکتا ہے وجودیت ایک ایسا فلسفہ ہے جو فرد کی زندگی کو معاشرے کے ساتھ مربوط کرتا ہے اور وجود کے تناظر میں دنیا اور اس کی مختلف اشیاء کو پرکھتا ہے۔

ا۔ ناول "پتلیاں" کی کہانی میں تصور وجود

اُردو ناول نگاری میں انیس ناگی کا نام اپنی الگ پہچان رکھتا ہے اگر ناول نگاری کی تاریخ پر نظر دوڑائی جائے تو انیس ناگی کے بغیر اُردو ناول کی فضا نامکمل دکھائی دیتی ہے۔ اُن کے ناول معاشرے کے مختلف افراد کی داخلی کیفیات کے آئینہ دار ہیں۔ انھوں نے جس حقیقی تناظر میں معاشرے کے کرداروں کی ظاہری اور باطنی حالت کو بیان کیا ہے وہ دوسرے ناول نگاروں کے ہاں بہت کم دکھائی دیتا ہے۔ اُن کے ناولوں میں جو عنصر سب سے زیادہ کارفرما نظر آتا ہے وہ وجودیت ہے اور اس حوالے سے قاضی جاوید لکھتے ہیں:

> "وجودیت بنیادی طور پر قیاسی نوعیت کے فلسفوں سے بالکل مختلف ہے، اسے "عمل تحریک" یا "عمل کا نظریہ" قرار دیا جاسکتا ہے۔ ایک ایسا نظریہ جو انسانی زندگی کو ممکن بنادیتا ہے۔ اسے عمومی طور پر ایک نوح کی اخلاقیات کا نام بھی دے دیا جائے تو بے جا نہ ہو گا لیکن جب ہم سارتر کی وجودیت کے لیے اخلاقیات کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو اس کا مفہوم روایتی اخلاقیات سے یکسر مختلف ہونا چاہیے۔ روایتی اخلاقیات انسانی فطرت یا جوہر کو ایک طے شدہ امر تسلیم کرتے ہوئے ایسے عالمگیر اصول دریافت کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ جو اخلاقی انتخاب میں انسان کی رہنمائی کریں اور جن کے مطابق عمل کرتے ہوئے فرد خود کو اپنی فطرت کے مطابق ڈھال سکے۔ "[۳]

مجموعی طور پر اگر جائزہ لیا جائے تو ادب کے بارے میں انیس ناگی کی فکر مغرب سے مستعار ہے۔ موصوف مغربی لکھاریوں کامیو اور سارتر سے متاثر نظر آتے ہیں۔ انیس ناگی کے ناول "پتلیاں" کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ اس کے کردار وجودی کرب میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ انسان کے بارے میں ان کے خیالات دیکھئے۔

"تمام انسان ایک طرح کے نہیں ہوتے، ان کا انفرادی ماحول ان میں تبدیلیاں پیدا کرتا رہتا ہے۔ زندگی گھر کی دہلیز سے شروع ہوتی ہے۔ زندگی میں تین طرح کے افراد ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو کچھ ماں باپ سے حاصل کرتے ہیں اسے کھو دیتے ہیں دوسرے وہ ہیں جو ماں باپ سے حاصل شدہ وراثت کو عروج پر لے جاتے ہیں۔ تیسرے وہ ہیں جو نہ آگے بڑھتے ہیں اور نہ پیچھے بلکہ گھر کی دہلیز سے دنیا کو دیکھتے اور اپنے آپ کو سہتے رہتے ہیں اور کچھ نہیں کر سکتے۔" (۴)

ادب اور وجودیت کا آپس میں گہرا رشتہ ہے وجودیت انسان کے وجود کا تجربہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی زندگی کا موضوع بھی ہے۔ فرد کی ذات سے لے کر، سماج، کائنات، زندگی اور موت کی حقیقت کو جاننے کی کاوش ہی وجودیت ہے۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کی تباہ کارویوں نے اخلاقی تباہی اور منافرت کو پیدا کر کے انسان کو اندرونی قرب اور انتشار کا شکار کیا۔ جس سے انسان کی توجہ اپنے وجود کی طرف مبذول ہوئی اور اُس نے داخلیت پر انحصار کرنا شروع کیا۔ اس داخلی کرب نے انسان کو غیر عقلی حقائق کی طرف مائل کیا۔ وجودیت کی دو اقسام ہیں دینی اور لادینی۔ وجودیت کیا ہے اس حوالے سے ڈاکٹر سی۔ اے قادر لکھتے ہیں:

"خدا کے وجود سے انکار کے بعد سارتر نے لادینیت سے ایسے نتائج اخذ کیے ہیں جو اس کے وجودی فکر میں سنگ میل کی حیثیت کے حامل ہیں۔ اس کے بقول وجودیت ایک لادینی صورتِ حال ہے۔" (۵)

ناول پتلیاں میں دیکھا جائے تو معاشرہ مجموعی طور پر تضادات کا شکار ہے۔ سماجی محرومیوں اور وجودیت پرستی نے انسانی رشتوں اور سماجی نظام کو کھوکھلا کر دیا ہے انسان تنہائی، کرب، بے چینی اور عدم استحکام کا شکار ہے۔ وجودیت کے لکھاری انیس ناگی ان سب حالات سے گہرا اثر لے کر فن پارہ میں اپنے معاشرے کے مختلف کرداروں کو مغربی تناظر میں پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔

"پھر کیا ہوا؟ ہم مشرقی خود ایڈز سے کم ہیں، ایک دفعہ اندر داخل ہونے دیں
سب دلدر دور ہو جائیں گے۔ وہاں ان کی ایک ماہ کی تنخواہ ہمارے ایک سال
کی تنخواہ سے بھی زیادہ ہے وہ کنجر افتخار مزے کر رہا ہے ہمارے ساتھیوں میں
سے ابھی تک صرف ایک امریکہ پہنچ سکا ہے۔ یار کیا چھوکری تھی، آنکھ امجد
سے لڑاتی تھی اور شادی افتخار سے کر لی۔" (۶)

انیس ناگی کا ناول "پتلیاں" انیسویں صدی کے انسان کے شعور کی کہانی ہے وجودی فکر کے حوالے سے ایک مغربی ناول نگار "دوستویفسکی" کے نظریات سے انیس ناگی بہت متاثر ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ موصوف نے اپنے ناولوں میں واقعات کے بجائے تصورات کو جگہ دی ان کے ناول انسانی شخصیت کی دوہری معنویت کے آئینہ دار ہیں، اپنے ناول میں معاشرے کے نوجوان طبقہ کی وجودی کشمکش کو وہ یوں بیان کرتے ہیں:

"یار کہاں لکھا ہے کہ ہم ڈاکٹری پڑھ کر ڈاکٹر بنیں، اس کا موقعہ نہیں مل رہا،
ہم سب پڑھائی میں تیز ہیں تو ڈاکٹر بن گئے ہیں، کیوں نہ سول سروس کا امتحان
دیں اور جو کچھ نہیں مل رہا اسے حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ ہاتھ میں
اقتدار کا ڈنڈا ہو تو پھر امریکہ جانے کی بھی کیا ضرورت ہے۔" (۷)

مغربی ادیبوں سے متاثر ہو کر انیس ناگی نے ادب اور فلسفہ میں نئے منظر تراشے اور نئی جہتوں کو متعارف کرایا۔ لایعنیت کا فلسفہ ناول "پتلیاں" میں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ یہ فلسفہ مغربی فلاسفر البیر کامیو کا ہے جس سے متاثر ہو کر انیس ناگی نے بیان کیا ہے کہ انسان اپنی زندگی میں ایک مسلسل عذاب میں مبتلا ہے وہ اپنی زندگی کو خوشگوار بنانا چاہتا ہے۔ انیس ناگی کے ناول میں کردار اپنی بھرپور وجودیت کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔ جو حالات کی پیچیدگیوں میں گم ہو کر مجبور ہو گئے ہیں اُن کو جن حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ مضحکہ آمیز ہے۔ حالات کی دیوار سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے ہیں جس کے بعد مایوسی اور ذہنی اذیت اور خوف ان کی زندگی پر مسلط نظر آتا ہے۔

انیس ناگی نے بھی مغربی ادیبوں کی طرح شخصی آزادی کو بڑی شد و مد کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ناول نگار انسان کی نفسیات کو حقیقی تناظر میں فلسفیانہ رنگ دے کر یوں بیان کرتے ہیں کہ انسان کی وہ انفرادی سوچ معاشرے کی مجموعی سوچ کی عکاس نظر آتی ہے۔ اسی حوالے سے وہ اپنے ناول میں یوں رقمطراز ہیں:

"بعض دفعہ بازار میں جب کوئی اسے میاں جی کہہ کر پکارتا ہے تو وہ ایک دم جھرجھری لے کر سوچتا ہے کہ میں واقعی بوڑھا ہو گیا ہوں۔ ابھی کل ہی کی بات تھی کہ وہ اس شہر کی سڑکوں پر اچھلتا کودتا پھرتا تھا۔ اس کی جوانی کا کسی نے نوٹس نہیں لیا لیکن اس کے جاننے والے اس کے بڑھاپے کا نوٹس لے رہے ہیں جمیل کو بس یہی ملال ہے کہ وہ کچھ کئے بغیر یوں ہی بوڑھا ہو گیا ہے۔ اس کے بڑھاپے کا احساس اس کی جوان اولاد ہے جو اس کے رنگین کپڑوں پر اعتراض کرتی ہے اسے بات بات پر ٹوکتی ہے اور بعض دفعہ تو یہ بھی کہہ دیتی ہے کہ زوال عمر کے ساتھ اس کا ذہنی توازن بھی اپنی جگہ سے ہل رہا ہے۔"(۸)

انیس ناگی اپنے ناول میں زیادہ تر متوسط طبقے کی ذہنی کیفیت کو بیان کرتا ہے۔ اس مجموعی صورت حال کو آسان اور پُر اثر انداز میں کھینچتا ہے۔ معاشرے کے اس طبقے کی ذہنی و جذباتی کشمکش کے حوالے سے ناول نگار معاشرے کا نبض شناس معلوم ہوتا ہے۔ جو وجودیت پرست عناصر کے احساس و خیالات کو خوب پرکھتا ہے اور اپنے منفرد انداز میں مہارت کے ساتھ پڑھنے والے کے ذہن میں اُتار دیتا ہے۔ ناول میں ایک جگہ پر پڑھے لکھے طبقے کی سوچ کو یوں بیان کرتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ اعلیٰ ڈگری حاصل کرنے کے بعد اس کی قدر و قیمت بھی بڑھ جائے گی اور اسے کسی بڑے کالج میں تعینات کیا جائے گا وہ اسی انتظار میں تین سال ایک دور دراز کے انٹر کالج میں منتظر رہا لیکن محکمے نے اس کی طرف توجہ نہ کی۔ اسے بتدریج یہ احساس ہونے لگا کہ اس نے خواہ مخواہ پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اسے بتدریج احساس ہونے لگا تھا کہ اس معاشرے کو تعلیم کی ضرورت نہیں اسے صرف کاریگروں اور دکانداروں کی ضرورت ہے۔

ناول کے کردار ماضی اور حال کی کشمکش میں وجودی مسائل کا شکار ہیں اسی کش مکش میں وہ زندگی کی تلخ حقیقتوں کا سامنا کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی زندگی مسائل کا شکار ہو کر پاش پاش ہو رہی ہیں۔ اِسی حوالے سے ناول کا ایک اقتباس دیکھئے:

"اس سارے حادثے سے جمیل کو ایک ایسے فیصلے کے لئے مجبور کیا جس کے بارے میں اس نے سوچا نہیں تھا، پروین نے اس کی منت سماجت بھی کی مالی مشکلات کا رونا بھی رویا۔ میں اس ذاتی تحقیر کو برداشت نہیں کر سکتا، کوئی

بات نہیں، کچھ دیر کی سختی ہے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ ادلے کا بدلے کا
معاشرہ ہے۔ تم نے مجھ سے برائی کی میں تم سے کروں گا، یہاں عفو نہیں
ہے۔" (۹)

ناول کی مرکزی کردار پروین جس ذہنی انتشار کا شکار ہے اُس کو معاشرے کے ایسے نسوانی کرداروں کے حوالے سے پرکھنا درست نہ ہو گا۔ ہاں ناول نگار کی باتیں معاشرے کے اکثر نسوانی کرداروں کے حوالے سے حقیقی ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ انسان کی لمحہ بہ لمحہ گزرتی ہوئی زندگی مایوسی، تاریخی اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ ناول میں ایک جگہ پر پروین کے جمیل کے بارے میں خیالات پیش ہیں:

"پروین کو بعض اوقات جمیل کا رویہ غیر معمولی لگتا ہے۔ اسے کم سے کم یہ
علم ضرور ہے کہ وہ ایک ایڈ ہاک قسم کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس نے
چیزوں اور لوگوں سے عارضی قسم کی مطابقت پیدا کی ہوئی ہے۔ اس کے من
میں کیا ہے؟ یہ وہ نہیں جان سکی۔ وہ اکثر اسے کہتی۔ تم ڈپلو میٹک قسم کے
آدمی ہو۔ تمہارا عورتوں کے بارے میں رویہ عجیب سا ہے۔" (۱۰)

ناول کے مختلف کرداروں کے حوالے سے وجودی کشمکش کو بیان کیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ناول نگار نے وجود کو جوہر پر مقدم کرنے کی کوشش کی ہے ناول میں وجودیت جگہ جگہ کار فرماں نظر آتی ہے لیکن اگر دیکھا جائے تو وجودی تصورات کی تخلیق پہلے سے ہے۔ جس کے ساتھ جڑ کر یہ تصورات سامنے آتے ہیں۔ تخلیق وجود سے پہلے ہے اس حوالے سے قاضی جاوید کے الفاظ درج ذیل ہیں:

"انسان کی بنائی ہوئی کسی شے پر توجہ کیجیے، مثلاً کوئی کتاب یا کاغذ کو ہم دیکھتے
ہیں کہ کس کاریگر نے اسے بنایا ہے اور اس کے ذہن میں اس کا تصور پہلے
سے موجود تھا۔ اس نے کاغذ تراش کے تصور اسے بنانے کی پہلے سے موجود
ترکیب پر یکساں توجہ دی ہے یہ ترکیب اس کے تصور ہی کا ایک حصہ ہے اور
حقیقت میں ایک فارمولا ہے۔ لہٰذا کاغذ تراش ایک طرف تو ایسی شے ہے
جسے ایک مخصوص انداز میں بنایا جاتا ہے اور دوسری طرف وہ ایک ایسی شے
ہے جو ایک خاص مقصد پورا کرتی ہے۔" (۱۱)

ناول نگار کی تحریروں کا اگر جائزہ لیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ موصوف کا بہاؤ زیادہ تر وجودی رویوں کی طرف رہا اُن کی تحریروں پر مغربی ادیبوں کے اثرات آسانی سے تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ ناول "پتلیاں" میں

معاشرے کے امیر اور غریب طبقے کے وجودی مسلئے کو یوں بیان کرتے ہیں۔ سر آپ سے کس نے کہا میں دہشت گردھوں دہشت گرد تو وہ ہیں جو بڑی بڑی پجارو جیپوں میں پھرتے ہیں۔ بری بڑی کوٹھیوں میں رہتے ہیں۔ اپنی بیویوں کو دو دو کروڑ کی کوٹھیاں ڈفینس سوسائٹی میں بنا کر دیتے ہیں، جو زندگی میں چور دروازے سے آتے ہیں ہم تو ان کی دہشت میں رہتے ہوئے دہشت گرد کہلاتے ہیں۔

ناول میں جہاں وجودیت پرست عناصر کی زندگی کے مختلف پہلووٗں پر روشنی ڈالی گئی ہے وہاں ایک اہم پہلو داخلی واردات ہے واردات اُن کرداروں کا پیچھا نہیں چھوڑتی اور مختلف قسم کے نشیب و فراز سے گزرتی ہوئی محو سفر رہتی ہے۔ ناول کے ایک نسوانی کردار کی داخلی واردات دیکھئے۔ پروین ایک عام لڑکی کی طرح اسی ادھیڑ بن میں رہتی کہ عمران صرف جسمانی تعلق کے لئے اس سے دوستی چاہتا ہے یا وہ اس تعلق کو کسی دائمی رشتے میں تبدیل کرنا چاہتا تھا۔ اسے اپنی حیثیت کا بھی احساس تھا کہ اس کا باپ ایک اوسط درجے کا تاجر ہے جو زندگی میں سہولت تو پیدا کر سکتا ہے لیکن اسے دے نہیں سکتا۔ اس لئے اس کا عمران سے جوڑ بے جوڑ ہو گا وہ اس مخمصے میں فلسفہ کی کتابیں بھولنے لگی تھی۔

ناول نگار نے معاشرے اور افراد کے درمیان روابط اور احساسات و جذبات کو کئی زاویوں سے دیکھا ہے مختلف افراد کے جذبات و احساسات کی مختلف پرتوں کو نمایاں کیا ہے، ناول "پتلیاں" میں ناول نگار نے معاشرے کے بہت سارے پہلوؤں کو وجودی حوالے سے بے نقاب کیا ہے۔

وجودی تصور کرب:

ناول کے کردار جس وجودی کرب کا شکار ہیں اور ناول نگار نے جس طرح انھیں پیش کیا ہے وہ تصور ہمیں کرکیگارڈ کے ہاں ملتا ہے، جو اضطراب، دہشت اور کشمکش کرکیگارڈ کے ناولوں میں دیکھائی دیتی ہے۔ اُس کا اثر کسی حد تک انیس ناگی کے ناول "پتلیاں" میں دیکھا جا سکتا ہے۔

> "اسے احساس تھا کہ اس کی سوتیلی ماں اس کی شادی کی پذیزائی کرے گی کیونکہ وہ گھر سے اس کا انخلا چاہتی تھی اس کے نزدیک پروین کا باپ ہر معاملے میں اس کی بات مانتا تھا کیونکہ وہ اپنے خاندان کی پہلی جنریشن تھی جو ایم اے یا اعلیٰ تعلیم کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ پروین اپنے بارے میں اپالوجیٹک ہوتے ہوئے اپنی سبکی محسوس کرتی تھی۔" [۱۲]

ناول کے کرداروں کے مطالعہ سے لگتا ہے کہ وہ اپنی ذات کے اثبات کی تلاش چاہتے ہیں اور اپنی ذات کی تاریکی سے نکل کر خود آگاہی چاہتے ہیں اور بعض کرداروں کے ہاں اس کے بالکل متضاد تصور ملتا ہے کہ وہ اپنی ذات کی تاریکی سے نکلنا تو چاہتے ہیں لیکن اُن کا مقصد خود آگاہی نہیں بلکہ زمانے کی رو کے ساتھ بہنا ہے وہ زندگی کے آفادی پہلو کو مد نظر رکھ کر محو سفر ہیں۔ خود آگاہی کا تصور اُن کے ہاں برائے نام دکھائی دیتا ہے۔ کرب کی کیفیت ایک ایسی کیفیت ہے جب کسی فرد پر قائم ہوتی ہے۔ تو وہ گومگو کا شکار ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو دوراہے پر کھڑا محسوس کرتا ہے۔ وہ اس حالت سے نکل کر آگے بڑھنا چاہتا لیکن کیفیت کرب اُس کے پاؤں کی زنجیر بن جاتی ہے ناول کا مرکزی کردار جمیل بھی اسی حالت میں مبتلا دکھایا گیا ہے۔ جس سے ناول نگار نے ایسے بہت سارے معاشرتی کرداروں کی اس حالت سے پردہ اٹھایا ہے۔ ناول سے ایک اقتباس دیکھئے:

> " جمیل نے مسکرا کر ٹیلیفون بند کیا، ایک پل کے لیے اس نے سوچا کہ وہ اپنے قلم سے بہت سے فائدے اٹھا سکتا ہے جس طرح بہت سے صحافی کر رہے ہیں کہ کرائم رپورٹر سے ایس ایچ او ڈرتے تھے۔ ایڈمنسٹریشن سے منسلک رپورٹر سیاسی لوگوں سے ہر طرح کی مراعتیں حاصل کرتے ہیں ادبی فیچر رائٹر بیرون ملک مشاعروں میں جاتے ہیں اور وہاں سے آکر اپنے کالموں میں غیر ادیبوں کی بڑی بڑی تصاویر شائع کرکے انہیں ادیب بنا کر اپنی قیمت وصول کرتے ہیں۔ میں ایسا کیوں نہیں کرتا؟ میرے بھی بہت سے مسائل ہیں۔" (۱۳)

وجودی کرب کی جو مثال ہمیں کرکیگارڈ کے ہاں ملتی ہے کہ جس طرح حضرت ابراہیمؑ کو اللہ کی طرف سے حکم ملا بیٹے کو قربان کرنے کا ایک طرف بیٹا دوسری طرف حکم خداوندی اب کرب کی کیفیت ہی حضرت ابراہیم کو کسی فیصلے پر پہنچنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ زندگی کے بہت سے معاملات میں فرد اسی طرح کرب کی کیفیت سے گزرتا ہے۔ اور کرب ہی فرد کے لیے راہ کا انتخاب کرتا ہے۔ دنیا میں رہتے ہوئے فرد اور دنیا کے درمیان ایک کشمکش پیدا ہوتی ہے۔ جس سے وجود کی طمانیت نہیں ملتی۔ انیس ناگی کے ناول میں بھی کردار کرب کی کیفیتوں سے دوچار دکھائی دیتے ہیں۔ ایک ناول میں انیس ناگی لکھتے ہیں ۔ وہ یہ جانتی تھی کہ اپنی پسند کی شادی جلد ہی ناپسندیدگی میں ڈھل جاتی ہے۔ کیونکہ اپنے انتخاب سے پیچھے ہٹنے کا کوئی آپشن نہیں رہتا۔ اس کے کالج میں اس کی نصف درجن کولیگز جنھوں نے اپنی پسند کی شادی کی تھی، طلاق اور خلع کے مختلف

مرحلوں سے گزر رہی تھیں۔ انسان بدل کیوں جاتا ہے۔ اس نے کئی مرتبہ اپنے آپ سے سوال کیا تھا اس نے یہ سوال سارتر سے بھی کیا تھا۔ سب کی تحریروں نے خاموشی سے کہا تھا" بدلنا انسان کی فطرت میں شامل ہے۔

فرد وجود۔ در۔ دنیا کے ساتھ نبرد آزما رہتا ہے۔ کرب کی وجودیاتی کیفیت اُس پر طاری رہتی ہے فرد اساسی آسودگی محسوس نہیں کرتا۔ بقول احمد ندیم قاسمی:

تمام عمر مرا دشت میرے ساتھ رہا
تمام عمر تمنا رہی کہ گھر جاتا

ہائیڈ گر کے ہاں کرب کے تصور کو غیر ارضی سمجھا جاتا ہے جس میں فرد اپنے آپ کو ایڈجسٹ نہیں کر پاتا۔ فرد ہستی کی دم بدم بدلتی ہوئی صورت حال سے فرار چاہتا ہے مگر کرب کی کیفیت اُسے ہستی سے رشتہ استوار کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اس صورت حال میں فرد یہ سمجھنے سے قاصر رہتا ہے کہ وہ کیا ہے؟ کیا کر سکتا ہے اس صورت حال سے نئے امکانات سے دوچار ہونا ہوتا ہے۔ کرب کی اسی اساسی کیفیت کو انیس ناگی اپنے ناول میں یوں پیش کرتے ہیں۔ وہ پہنچ رہی ہو گی، سب کو پریشان کر رہی ہو گی۔ اسے پہلے ہی شک ہے کہ میں شراب پیتا ہوں علی تم ان جکڑ بندیوں سے آزاد ہو کیا میں دوبارہ جوان ہو سکتا ہوں؟ میں شادی کے جہنم سے دور رہوں گا، عورت سے تعلق اور کسی بندھن سے بچ جاؤں گا۔

فرد معاشرے میں رہتے ہوئے جن کیفیات سے دور چار رہتا ہے وہ اس کو نیا فیصلہ اور نیا انتخاب کرنے پر مجبور کرتا رہتا ہے۔ کرب کی ان حالتوں کا سامنا کرنا فرد کی مجبوری ہے۔

اگر نہ درد مری روح میں اتر جاتا
میں جیسا بے خبر آیا تھا بے خبر جاتا
(احمد ندیم قاسمی)

فرد اپنے وجود کے تقاضوں کی تکمیل کے لیے جدوجہد مسلسل کرتا ہے۔ مگر کوشش جدوجہد اور عمل زمانیت کی تحریر کا شکار رہتا ہے اور اس کے لیے کرب مسلسل کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ کرب صرف جسم و جان کی تریتب و ترکیب ہی نہیں بلکہ اس میں آرزوئیں اور تمنائیں بھی ہوتی ہیں۔ جس کی وجہ سے فرد کو عمل سے پہلے غیر یقینی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کرب کے ساتھ تشویش بھی ہے جو فرد کو امکانات میں دھکیل دیتی ہے۔ جس سے مجرد حقیقتیں، حالات و واقعات اور رکاوٹیں فرد کے ساتھ نبرد آزما ہوتی ہیں۔ فرد اسی تشویش کے ساتھ حد بندیوں کو توڑتا چلا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سی اے قدر اسی کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

"ہائیڈ گر کے فلسفے میں تر دو (تشویش) کی خاص اہمیت ہے۔ تر دد (تشویش) تین وجوہات سے پیدا ہوتا ہے۔ ایک تو ہر انسان کو فکر لاحق ہے کہ مستقبل میں وہ کیا بنے گا۔ وجود کا تقاضا ہے کہ ہر انسان ہر وقت اپنا سامنا کرے اور مستقبل کی عمارت خود قیاسی پر تعمیر کرے یہ چیز پریشانی اور تر دد کا باعث بن جاتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان اس کائنات میں پھینکا گیا ہے جو پریشانی اس امر سے پیدا ہوتی ہے وہ "ماضی" کو بناتی ہے تیسرا سبب یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں پھنسا ہوا ہے اور مختلف کاموں میں مشغول ہے۔" (۱۴)

ناول کی فضا کرب کے اثرات سے پُر ہے ناول نگار نے معاشرے کے افراد کے درمیان کرب کی کیفیت کو درجہ بہ درجہ بیان کیا ہے اور اس کے نتائج پر روشنی ڈالی ہے کہ کس طرح افراد معاشرتی اُونچ نیچ میں کھو کر نئی سوچ کو جنم دیتے ہیں اور یہ سوچ کس طرح سے افراد کو عمل کی طرف گامزن کرتی ہے۔ ناول کا ایک نثری ٹکڑا ان باتوں کی نشاندہی کچھ اس طرح سے کرتا ہے۔ مجھ میں قوت فیصلہ کی کمی ہے لیکن میں فیصلہ بھی کر لوں تو اس سے کیا حاصل ہو گا؟ کیا مجھے مناسب نوکری مل جائے گی؟ کیا میں باہر جا سکوں گا۔ ان باتوں کا امجد کے پاس کوئی مناسب حل نہیں تھا۔ اس کے ذہن کے اس گوشے میں اُمید چھپی ہوئی تھی کہ آخر کوئی نہ کوئی اس کی مدد ضرور کرے گا۔ اس نے کئی مرتبہ ادھر اُدھر نظر گھما کر دیکھا، اسے اپنے ماں باپ سے ایک طرح کی کمی تھی کہ اس کے ابتر حالات ان کے پیدا کر دہ تھے اگر اس کے ماں باپ کی مالی حالت بدتر نہ ہوتی تو وہ آج اس ذلت کا شکار نہ ہوتا۔

ناول کے کرداروں کے اندر داخلی کرب کا ایک سلسلہ ہے جو لمحہ بہ لمحہ اپنی حالت کو بدلتا ہے اور فرد کو ہونے یا نہ ہونے کی کیفیت میں مبتلا کرتا چلا جاتا ہے۔ ناول کے مرکزی کرداروں کی داخلی سوچ اُن کو مسلسل وجود کرب میں گھیرے رکھتی ہے اگر وہ ایک کیفیت سے نکلتے ہیں تو دوسری میں مبتلا ہو جاتے ہیں اُن کا وجود یا تو اس کرب سے لذت کشید کرتا ہے یا مایوسی و اُکتاہٹ میں ڈالتا ہے۔ ناول میں انیس لکھتے ہیں۔ جمیل نے جواب نہ ملنے پر اپنی ہتک محسوس کی۔ وہ اس قسم کی بہت سی، ہتکیں برداشت کر چکا تھا۔ وہ جوابی کاروائی کر سکتا تھا لیکن اسے ہمیشہ یہی خدشہ لاحق رہتا کہ کہیں امجد خودکشی نہ کر لے۔ وہ اس کے تمام نفسی اور ذہنی رجحانات کا بغور جائزہ لیتا اور اس کے علم کے مطابق امجد میں خود شکستگی کا رجحان بڑا قوی تھا اس لئے وہ امجد کے ساتھ بے

حد نرمی سے پیش آتا کہ اسے کم سے کم یہ احساس ہو کہ ہر طرح کے حالات میں جمیل اس کا ساتھ دے رہا ہے۔

زندگی میں جب جمود کی کیفیت پیدا ہو جائے تو اس کی اساسی کیفیت کرب کو جنم دیتی ہے۔ زندگی وجود برائے خود بھی ہے اور وجود بذات خود بھی، وجود بذات اور وجود خود ایک دوسرے کو اپنے اندر ضم کرنا چاہتے ہیں جس سے فرد اکتاہٹ اور مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے۔ رضا عابدی کا خیال ہے کہ:

> "سارتر نے زندگی کو لیس دار مادے سے تشبیہ دی ہے، یہ ٹھوس جسم اور مائع کے درمیان کی حالت ہے۔ زندگی ایک ایسا سیال مادہ ہے جس میں بہاؤ ہے مگر یہ ٹھراؤ کی جانب مائل ہے۔ یہ ایک لو تھڑے کی طرح ہے مگر اسے گرفت میں نہیں کیا جا سکتا۔ جس آدمی میں زندگی کی رو تھم جائے اسے زندگی ایسی ہی رُکی رُکی گاڑھی ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ جس انسان میں حرکت نہیں رہتی جمود آ جاتا ہے، جس کی رگوں میں تازہ خون جوش نہیں مارتا جس کی حیات کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں اسے زندگی کس طرح چمٹ جاتی ہے اس میں ہر چیز جمتی چلی جاتی ہے۔ اسے اس چپچپاتی ہوئی زندگی سے متلی ہونے لگتی ہے۔" (۱۵)

ناول نگار نے اپنے اس ناول میں کرداروں کے ذریعے ایسی فضا قائم کر دی ہے جس سے افراد داخلی کشمکش کی وجہ سے گھٹن کراہت اور بے دلی کا شکار ہیں۔ اس میں معاشرے کے افراد کی مجموعی سوچ میں معاشرے کے اکثر و بیشتر افراد مبتلا ہو کر اپنی زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں۔ ناول میں ایک جگہ اس پہلو پر روشنی ڈال کر ناول نگار نے اپنے معاشرے کے افراد کی کسمپرسی کو عیاں کیا ہے۔ سختیاں سہو، پانچ چھ مہینے میں تمہاری بیگم کی ملازمت ختم ہو جانی اور اگر یہ اخبار بند ہو گیا تو تم بھی بے روزگار ہو جاؤ گے، تمہارے پاس رہنے کے لئے مکان نہیں ہے، تمہار بیٹا ابھی اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہوا تم کس دنیا میں رہتے ہو، اس وقت خواجہ دباؤ میں آ کر ایک کنال زمین ایک لاکھ کے عوض دینے کو تیار ہے روپے کا جلدی بندوبست کرو تمہیں احساس نہیں ہے کہ وقت کم ہے اور چند دنوں میں حالات بدل جائیں گے۔

کراہت، گھٹن، مایوسی جیسے عناصر جب وجود پر اپنا اثر ڈالتے ہیں کو وجود کو اپنے سامنے دنیا عیاں نظر آتی ہے، اور یہ سب وجود کو اظہار کی راہ سجھاتی ہیں۔ راستے ہموار ہوتے ہیں اور پیچ و خم میں مبتلا وجود کی گرہیں

کھلنے لگتی ہیں۔ ایسے ہی ہے جیسے ایک کشتی منجدھار سے نکل کر کنارے کی طرف رُخ کرے یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ بھنور کشتی کو کسی راستے کی طرف دھکیل دے جس پر چل کر وہ منزل کو پا سکے۔ فرد معاشرے میں رہتے ہوئے مکافات کی موجودگی میں فیصلے کرنے پر مجبور ہے۔ وجود کا یہ المیہ ہے کہ وہ موجودہ صورت حال کے مطابق رہتا ہے ناول کے کردار جس فضا میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں وہ لمحہ موجود ہے اور اس لمحہ موجود میں معاشرے کے رسم و رواج سے چھٹکارا پانا ناممکن ہے انیس ناگی نے کرداروں کو معاشرتی رسم و رواج کی زنجیروں سے باندھ کر اس طرح سے پیش کیا ہے کہ ناول ''پتلیاں'' کا ماحول ہمارے معاشرے کے ماحول کی اس صورت حال کو بیان کرتا ہے جس میں کرداروں کے ذریعے معاشرے کے رسم و رواج اور اس ماحول میں بسنے والے افراد کی ذہنی عکاسی کی گئی ہے۔ جو ناول نگار نے یوں بیان کی ہے۔

> "میرا خیال ہے پروین کہ آدمی اپنے لئے بہت کم زندہ رہتا ہے دوسروں کا دباؤ اسے ہر طرف دھکیلتا ہے تنہا آدمی تو ایک وقت کی روٹی کھا کر بھی زندہ رہ سکتا ہے یہ رشتہ دار عزت کا مسئلہ فلاں کیا کہے گا، فلاں ہمارے بارے میں کیا سوچے گا، مجھے یہ سب باتیں احمقانہ لگتی ہیں کیا ہم یہ زنجیریں توڑ نہیں سکتے ''نہیں'' رسم کی زنجیر سے سنیاسی اور درویش آزاد ہوتے ہیں۔ تم اور میں تو وہ ہیں جنہوں نے زندگی کو ان شرائط پر قبول کر لیا ہے جس طرح یہ ہے۔"[۱۶]

وجود دنیا سے مربوط ہے اور یہ فیصلے اپنے موضوع کے مطابق کرتا ہے موضوع پر انحصار کر کے اپنے آپ کو منوانے کے لئے جہد مسلسل کرتا ہے موضوعیت مصوفیت کا سامنا کر کے اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ کسی چیز کو قبول کرنا ہے یا رد۔ وجود کو خواہ کوئی بھی نام دیا جائے یہ اپنے اثبات کا متلاشی رہتا ہے۔ وجودی حوالے سے اگر دیکھا جائے تو فرد کی اپنی ذات کی تفہیم ہی ایک بڑا مسئلہ ہے ہمہ وقت اسے ایک کمی کا احساس ستاتا ہے وہ ہر وقت زندگی کے مسائل جھیلتا ہے اور ہمہ وقت الجھاؤ کا شکار رہتا ہے وہ خود نہیں جانتا کہ اپنے آپ کو کیسے صحیح ثابت کرے۔ وہ خود اپنی ذات کے مفہوم کے مسئلے کو جھیلتا ہے۔ وہ معاشرے میں اپنے آپ کو کٹھ پتلی سمجھتا ہے جس کی ڈور کسی دوسرے کے ہاتھ میں ہے اور اس بے اختیاری کا روگ اسے دیمک کی طرح چاٹتا رہتا ہے۔ معاشرے میں رہنے والے ایسے افراد کی نمائندگی کرتے ہوئے ناول نگار لکھتا ہے۔ گذشتہ پچیس سالوں میں میں نے ارد گرد کی دنیا کو اچھی طرح دیکھا تھا اور اسے یقین تھا کہ یہاں سب کچھ اسی طرح رہے گا۔ یہاں

اسے اکیلے ہی جدوجہد کرنی ہے کوئی کسی کا ساتھی نہیں ہے اسی طرح ناول میں ایک جگہ لکھتے ہیں یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا زمانہ ہے یہاں ہر سطح پر دوغلا پن ہے میں کس کے لئے انصاف چاہتا ہوں میں تو خود ناانصافی کا شکار ہوں۔ میں نے ایک ردِ عمل میں ایک طویل مدت ایک سست کیڑے کی طرح بسر کر دی ہے میں اِس نظام سے باہر رہ کر کچھ نہیں کر سکتا۔ مجھے اس کی رگ رگ میں سما کر وہی کچھ کرنا چاہیے جو ہر پڑھا لکھا کرتا ہے۔

ناول میں امکان کی فضا بھی ملی ہے کرداروں کے رویوں اور سوچ و فکر سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ وہ مقدر کے لکھے پر کم اور ممکنہ صورت حال پر زیادہ یقین رکھتے ہیں۔ نوجوان طبقے کو اس طرح کی کشمکش میں الجھا ہوا دکھایا گیا ہے کہ وہ اپنے انتخاب کے توسط سے عرفان حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ناول کے مرکزی کرداروں کو ہمہ وقت یہ عمل وہ عمل یہ صورت حال وہ صورت حال کی کیفیت سے دوچار دکھایا گیا ہے۔

جنسی تصور وجود:

ناول کے کرداروں کو ایسی وجودی حالت میں مبتلا دکھایا گیا ہے کہ جس سے فرار اختیار کرنا اُن کے بس میں نہیں ہے۔ وہ اگر ایک وجودی خوف و نااُمیدی سے نکلتے ہیں تو دوسری حالت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ناول میں جہاں وجودیت کے حوالے سے بہت سارے پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے وہ ایک پہلو جنسی وجودیت کا بھی ہے ناول نگار نے بڑی مہارت کے ساتھ اس پہلو کو عیاں کیا ہے۔ فرد کی سوچ کس طرح عمر کے مختلف حصوں میں جنسی تصور کا شکار رہتی ہے اُس تصور کو زمانہ حال میں رہتے ہوئے بیان کیا ہے۔ معاشرے کا امیر طبقہ جس کے پاس آرام و آسائش کی کوئی کمی نہیں ہوتی اُس طبقہ کے نوجوانوں کی جنسی وجودیت کے حوالے سے ایک اقتباس درج ہے:

> "احمد کی اس کالونی میں شہرت اچھی نہیں تھی وہ اپنے نفس کا غلام تھا جہاں بھی اسے کوئی گھریلو کام کرنے والی عورت نظر آتی وہ اس کے پیچھے لگ جاتا اس کا انجینئر باپ اس کی فتوحات کے بارے میں سُنتا تو خوشی سے کہتا "جوان اسی قسم کے کام کرتے ہیں ٹھیک ہے اس کی کہیں شادی کر دیتے ہیں"۔ اس کی بیوی نے تنگ آ کر کہا تھا میں اپنی مرضی کی بہو لاؤں گی" ان کے یہ منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے جب ایک دن ہمسایہ افسر کی بیوی منہ پھلائے ہوئے احمد کے گھر آئی اور اس نے چپکے سے کہا، "آپ کو کچھ پتہ

بھی ہے کہ کیا ہو گیا ہے آپ کا بیٹا میری بیٹی سے زیادتی کر تا رہا ہے وہ دو ماہ
سے حاملہ ہے۔"(۱۷)

ناول میں جنسی تصور وجود کی مختلف جھلکیاں نظر آتی ہیں جن کا تعلق صرف کتابی حد تک محدود نہیں بلکہ وہ ہمارے معاشرے کے وہ حقیقی پہلو ہیں جن پر بہت کم لکھا گیا ہے اور اگر لکھا بھی گیا تو اس رخ سے مکمل پردہ نہیں اٹھایا گیا۔ معروف افسانہ و ناول نگار سعادت حسن منٹو کو یہ اعزاز حاصل ہے انھوں نے معاشرے کے اس پہلو کو بغیر کسی تذبذب کے اپنی تحریروں کا حصہ بنایا ہے جن کو ہر کوئی پڑھنا اور جاننا تو چاہتا ہے لیکن سیدھے رُخ سے نہیں بلکہ کنکھیوں سے۔ انیس ناگی کے ناولوں کا اگر مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ منٹو کی تحریروں سے موصوف نے اثر لیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ بے باکانہ انداز بھی منٹو سے مستعار معلوم ہو تا ہے۔ جنس کا جو تصور ناول نگار نے ناول "پتلیاں" میں پیش کیا ہے اُس کا تعلق معاشرے کے ہر طبقے سے ہے۔ اِس سے نچلے طبقے کے لوگ بھی متاثر ہوتے ہیں جنسی حوالے سے ناول نگار لکھتے ہیں:

"سٹوپیڈ تمہارا چچا کہتا ہے کہ پیٹ کی بھوک جنس کی بھوک کو مٹا نہیں سکتی۔
تم نے دیکھا نہیں کہ مانگنے والیوں نے پھٹے کپڑے پہنے ہوتے ہیں لیکن تین
چار بچے ساتھ لٹکائے ہوتے ہیں۔"(۱۸)

ناول میں جنسی تصور وجود پر فلسفیانہ انداز سے بحث کی گئی ہے اور یہ تصور مرد و عورت پر کس طرح اثر انداز ہوتا ہے۔ اُس کے رموز او قاف بیان ہوتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں یہ تصور کس طرح کار فرما ہے اور کس طرح یہ زندگی کے مختلف حصوں میں مختلف اذہان میں سفر کرتا ہے اور وہ کس طرح معاشرتی اور مذہبی پابندیوں کے باوجود اس میں گم ہو جاتا ہے اور کس طرح آدمی کی سوچ اس تصور سے متاثر ہو کر نئے نئے خیالات کو جنم دیتی ہے۔ مرد اس تصور کو لے کر کس طرح سے اپنی سوچ کو عورت کے ساتھ جوڑتا ہے۔ ناول میں ایک جگہ موصوف کہتے ہیں علی ہم لوگوں کی جنسی زندگی کیا ہے جو پچیس تیس سالوں کے بعد شادی کے ساتھ شروع ہوتی پھر چار پانچ سالوں کے بعد ایک پھیکی سی ضیافت بن جاتی ہے ہمارے ہاں عورت آدمی دو مخالف قوتیں ہیں جو پیہم مقابلے میں ہوتی ہیں اس لیے ان میں ہم آہنگی ممکن نہیں۔ یوں بھی دیکھا جائے اس سارے کھیل میں عورت کا رول ایک حد تک نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ وہ ریسونگ اینڈ پر ہوتی ہے اس کا بدن حسیات میں اشتعال پیدا کرتا ہے باقی کام تو مرد کا ہوتا ہے یہ بظاہر چند لمحوں کی لذت ہوتی ہے لیکن اس

کے اثرات بدن سے ماورا ہو جاتے ہیں۔ ہماری عورتیں اس بات پر اتراتی ہیں کہ ان کے بغیر مرد جی نہیں سکتے، میں پوچھتا ہوں وہ مرد کے بغیر جی سکتی ہیں؟

ناول میں فرد کی جنسی سائیکالوجی کو من و عن اسی طرح پیش کیا گیا ہے کہ کرداروں کی یہ انفرادی سوچ معاشرے میں رہنے والے افراد کی اجتماعی سوچ کا آئینہ ہے۔ جس معاشرے کا ہم حصہ ہیں یہ ایک اسلامی معاشرہ ہے جس کی شعبہ زندگی کے حوالے سے حد بندیاں ہیں جو اس کو مغربی معاشرے سے الگ کرتی ہیں۔ لیکن جنسی خواہش فرد کی زندگی کا ایک لازمی جزو ہے جس سے نہ مرد کنارا کش ہو سکتا ہے اور نہ عورت۔ مذہبی حد بندیاں یا معاشرتی حد بندیوں کی وجہ عمل میں رکاوٹ تو پیدا کر سکتی ہیں لیکن سوچ کسی حد تک اس سے متاثر نظر آتی ہے۔ جو عمر کے ہر حصے میں فرد پر اپنا اثر چھوڑتی ہے ایک اقتباس درج ذیل ہے:

" زبیدہ صبح، دوپہر اور شام کو کام کرنے آتی اور پھر اپنے کوارٹر میں چلی جاتی، ایک دو مرتبہ وہ اپنی بڑی لڑکی جمیلہ کو کوٹھی میں اُس وقت لائی جب جمیل گھر میں اکیلا تھا۔ جمیل نے ایک ہی نگاہ میں اس کا جائزہ لیا۔۔۔۔۔۔۔۔ لیکن وہ اپنی شرافت کا لبادہ پہننے پر مجبور تھا۔ زبیدہ کو کچھ پیسے ادھار چاہیے تھے جمیل نے کچھ سوچے سمجھے بغیر اسے سو روپے دے دیئے اور یہ بھی ظاہر کیا کہ اس نے یہ پیسے واپس نہیں لینے۔"(۱۹)

جنسی حوالے سے فرد کے وجودی تصور کے مختلف کونوں سے مختلف فکری، جذباتی و حسی تصورات کو ناول نگار اپنے احاطہ تحریر میں لا کر مرد و عورت کی نفسیاتی صورت حال کو بیان کرتے ہوئے ایک منظر تراش دیتے ہیں۔ فرد جن حسی تجربات سے گزر کر جنسی لذت کشید کرتا ہے ناول "پتلیاں" میں جگہ جگہ بیان ہوتے ہیں۔ جو کہیں پر تو معاشرتی و مذہبی حد بندیوں سے اپنے آپ کو آزاد محسوس کرتے ہیں اور کہیں اسے اپنی راہ کی رکاوٹ سمجھتے ہیں۔ معاشرے کے اس پوشیدہ گوشے سے ناول نگار نے پردہ ہٹایا ہے مکمل طور پر نہ سہی لیکن کسی حد تک معاشرتی سوچ اور فکر کو پرکھا ہے۔

انیس ناگی کا یہ ناول وجودی حوالے سے خاصی اہمیت کا حامل ہے جس کے کردار وقت اور حالات کے ہاتھوں "پتلیاں" بنے نظر آتے ہیں وہ سوچتے ضرور ہیں لیکن عملی جامہ پہنانے کے لیے وہ مقید معاشرہ ہیں۔ جنسی پہلو کے حوالے سے ناول نگار نے اس مجموعی سوچ کی عکاسی کی ہے جس کے تحت معاشرے کے افراد محو سفر رہتے ہیں اور یہ سوچ اُن کے وجود کا اس طرح حصہ بن جاتی ہے جس سے راہ فرار اختیار کر لینا ناممکن نظر

آتا ہے۔ یہ جذبہ وقتی طور پر دب تو جاتا ہے لیکن زندگی کے ساتھ ساتھ وقتاً فوقتاً فرد کو اپنے حصار میں لیے رکھتا ہے۔

"وہ راحت کے تصور سے اس کے وجود سے اپنے آپ کو آزاد کرنا چاہتا تھا۔ اس کا تنفس اس کا لمس اور اس کی موجودگی اس کے بدن میں اترتی جارہی تھی۔ وہ کام کرتے ہوئے بھی اس کو اپنے اندر سرایت کرتا ہوا محسوس کرتا تھا۔ وہ نرگس کے بدن میں اُتر کر راحت کو محو کرنا چاہتا تھا۔ راحت اتنی خوبصورت بھی نہیں تھی کہ اس کے حسن کا سحر اس پر طاری ہو جاتا لیکن راحت اسے مخل کر رہی تھی۔ اس کے دل کے کسی کونے کھدرے میں یہ احساس جرم بھی تھا کہ وہ ایک ایسی جذباتی انڈر گراؤنڈ مہم میں مصروف ہے جسے ممنوع تصور کیا جاتا ہے۔"(۲۰)

ناول نگار نے ادب کی دنیا کے ایک نامور افسانہ نگار و ناول نگار سعادت حسن منٹو کی تحریروں سے تاثر قبول کیا ہے اور معاشرے کے اُن پوشیدہ پہلوؤں پر قلم آزمایا جن پر لکھنے سے پہلے لکھاری سوچتے ہیں کہ کوئی معاشرتی پابندی ناحائل ہو جائے لیکن انیس ناگی اپنے ناول "پتلیاں" میں معاشرے کے اس پہلو سے پردہ اٹھاتا ہوا فرد کی سوچ کے جنسی زاویے کو پرکھتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ معاشرے کے افراد کی جنسی سوچ کی عکاسی کرتا ہوا ایک اقتباس دیکھئے:

"نرگس نے ہلکے رنگ کی Sleeve less قمیض پہنی ہوئی تھی۔ جو اس کے بدن پر چپکی ہوئی تھی۔ نرگس نے کسی حجاب کے بغیر آہستہ آہستہ اپنی قمیض کے بٹن کھولے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جمیل کے ایک پل کے لئے اس کی طرف دیکھا پھر نظریں نیچی کر لیں قدرے وقفے کے بعد اس نے وسکی کا ایک چھوٹا سا پیگ بنایا اور سر کے ایک ہی جھٹکے سے پی لیا۔ اوہ اوہ کیا کرتے ہیں جمیل صاحب، آپ کو تو نیند آ جائے گی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر جمیل کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگی۔"(۲۱)

ناول نگار جب معاشرے کے کسی پہلو پر بات کرتا ہے۔ تو نہایت سادہ الفاظ کا سہارا لیتا ہے اور کسی نقطہ کو واضح کرنے کے لئے یا تو ایک خوبصورت منظر تراش لیتا ہے یا بات کو ایک سے زیادہ افراد کے درمیان گفتگو

کے ذریعے پر اثر بنا دیتا ہے۔ نسوانی کرداروں کی گفتگو سے معاشرے سے نسوانی طبقہ کی جنسی سوچ کو انیس ناگی پر اثر انداز میں یوں بیان کرتے ہیں۔

"ہاں ٹھیک کہتی ہو سارا کریڈ میڈیا کرتا۔ ایک بات ہے بھارتی میک اپ کمال کا کرتے ہیں۔ کالی بھجنگ عورتوں کو ڈیشنگ بنا دیتے ہیں۔ ایک فلم میں مادھوری کا ۔۔۔۔۔۔۔ پروین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اصل میں مادھوری کو کچھ نہیں ہوا تھا اُس وقت پیڈیز بریزر نہیں مل رہے ہوں گے۔ کنول نے کہا اور دونوں نسوانی قسم کے قہقہے لگانے لگیں۔"(۲۲)

"پتلیاں" میں موصوف نے معاشرے کے ایک نسوانی طبقہ کی جنسی سوچ سے پردہ ہٹایا ہے اور اس تصور کو آسان اور عام فہم انداز میں ایسے پیش کیا ہے کہ لگتا ہے جیسے ناول نگار نسوانی جنسی تصور کا ماہر پارکھ ہو، ناول نگار کہیں پر تو مرد کی جنسی حسیات پر بات کرتا ہے۔ اور کہیں عورت کے حوالے سے مختلف تصورات پیش کرتا ہے۔ اور کہیں پر مرد و عورت کو موازنہ کے طور پر جنسی حوالے سے یوں سامنے لاتا ہے۔

"ڈاکٹر صاحب میرے سینے کی دھڑکن سنیں در دِل کی طرف ہوتا ہے، دونوں کی ایک پل کے لئے آنکھیں چار ہوئیں، امجد کے کان کی لوئیں ایک ہی لمحے میں تپنے لگیں۔ اس کی دو انگلیوں میں سٹیتو سکوپ کا اگلا حصہ مریضہ کے گداز سینے کا سفر کر رہا تھا۔ امجد کے سارے بدن میں سنسنی پھیل رہی تھی۔ ایک پل کے لئے اس کے من میں وحشت آئی کہ وہ سٹیتھو سکوپ اٹھا کر پھینک دے اس کی موٹی سہیلی کو کلینک سے نکال ۔۔۔۔، یہ موج خیال اس کے دماغ کو کاٹتا ہوا گزر گیا۔"(۲۳)

ناول کے کرداروں کے درمیان معاشی، معاشرتی اور جنسی تصور وجود کا ایک ملا جلا تاثر بھی ناول کی فضا کا حصہ ہے۔ جس کے پس منظر میں اگر دیکھا جائے تو معاشرے کی حقیقی تصویر ہمارے سامنے آتی ہے۔ کہ ہمارے معاشرے کے افراد معاشی تسکین کے ساتھ جنسی تسکین کی تلاش میں ہوتے ہیں لیکن جنسی وجودیت کبھی کبھی سب تصورات کو پیچھے دھکیل کر سامنے کھڑی ہو جاتی ہے۔ وہ جب تک وجود پر اثر قائم رکھتی ہے تب تک کوئی بھی منظر صاف نظر نہیں آتا۔ ناول "پتلیاں" کے کچھ کردار اسی دوہری کشمکش کے ساتھ سفر کرتے ہیں کرداروں کے درمیان یہ تضاد اُن کو کسی ایک صورت حال میں رہتے ہوئے زندگی گزارنے پر مجبور نہیں

کرتا۔ کردار اسی دہری کشمکش کو ساتھ لے کر چلتے ہیں جس سے ناول کی فضا ایک انتشاری کیفیت کو ظاہر کرتی ہے اسی بے یقینی میں کردار محو سفر ہیں۔

ایک مرد کا عورت کے بارے میں اور ایک عورت کا مرد کے بارے میں جو جنسی تصور ہے انیس ناگی نے اپنے ناول "پتلیاں" میں مختلف طرح سے بیان کیا ہے اور معاشرے کے اُن افراد کی ذہنی عکاسی کی ہے جو اس طرح کے جنسی تصور کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں۔ موصوف پورے معاشرے کا نہیں تو کم از کم معاشرے کے ایک بہت بڑے حصے کا نبض شناس دکھائی دیتا ہے۔ ناول نگار معاشرے اوراس کے افراد کے درمیان ہونے والی کشمکش کا احاطہ تو کرتا ہے لیکن جن تصورات کو ہمارے سامنے رکھتا ہے اگر اُن کو تنقیدی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو وہ مکمل دکھائی نہیں دیتے معاشرے اور افراد کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرنے کے لئے موصوف نے باریک بینی کا مظاہرہ نہیں کیا ایسے لگتا ہے جیسے کچھ کو سامنے رکھ کر بات کی گئی ہے۔ معاشرے کے وہ پہلو ابھی اور وضاحت طلب ہیں۔ جنسی حوالے سے انیس ناگی لکھتے ہیں:

> "امیر بوڑھے غریب جوان عورتوں سے شادی کیوں کرتے ہیں؟ امیر بوڑھی عورتیں جوان مردوں کو قیمت ادا کر کے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟ Hell with every body میں کسی کو جواب دہ نہیں ہوں۔ پروین کو بھی نہیں، گذشتہ پندرہ بیس سالوں سے میرا اس سے تعلق ہے۔ عورتیں جلدی ڈھل جاتی ہیں، بدن جو ایک ضیافت ہوتا ہے وقت کے ساتھ ایک گرتی ہوئی عمارت بن جاتا ہے۔"[۲۴]

انسان وجود کے صبر سے کبھی آزاد نہیں ہوتا، اس کے رحم و کرم پر زندگی کے دھارے میں بہتا چلا جاتا ہے اسے بہت سی پابندیوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ انیس ناگی کا ناول "پتلیاں" بھی ایک معاشرتی ناول ہے جس میں وجودیت بھری پڑی ہے اس ناول میں ناول نگار کے وجود کے کئی پرتوں کو کھولا ہے۔ کسمپرسی، بے یقینی اور انتشار کے چنگل میں پھنسے ہوئے افراد کو بھی متعارف کروایا ہے۔ جنسی وجود تصور کو جس طرح پیش کیا ہے وہ اس معاشرے کا ایک حقیقی پہلو ہے جس سے چشم پوشی تو کی جاسکتی ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ معاشرے کے اس تضاد کو افراد کی زندگیوں میں اس طرح کار فرما دکھایا گیا ہے جس طرح سعادت حسن منٹو کے ناولوں اور افسانوں میں ملتا ہے۔ موصوف نے جنسی تصور کو جس طرح پیش کیا ہے وہ خیالی کم حقیقی زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس تصور کو مکمل طور پر حقیقی کہنا درست نہ ہوگا۔ ناول نگار نے معاشرے کی جس

تصویر کو ہمارے سامنے رکھا ہے اس کے پیچھے وجود کار فرما ہو سکتا ہے۔ ناول میں کچھ کرداروں کے درمیان نفسی و بیزاری کی کیفیت اپنی نوعیت کی اہم کاوش ہے۔ کردار معاشرے میں نام نہاد شرافت کے پیچھے بے بسی، بے زاری اور بے اختیاری کا رونا روتے دکھائی دیتے ہیں اسی حوالے سے ناول سے اقتباس دیکھیے:

"میں اور میری ماں چچا کے گھر میں رہتے تھے جہاں ہماری حیثیت کمیوں جیسی تھی، چچا نے بھی اس لئے رکھا تھا کہ ہماری زمین سانجھی تھی۔ میں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا ہوا تھا اور کالج جانے کا سوچ رہی تھی۔ سارے گھر والے کوٹھے پر سوتے تھے اور عورتیں بچے دا لان میں، میں گرمیوں سردیوں کمرے میں سوتی تھی۔ میں نیند میں مدہوش تھی مجھے علم نہیں تھا کہ یہ سب کچھ خواب میں تھا یا حقیقت میں میں نے محسوس کیا کہ میرے اوپر کوئی لیٹا ہوا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔وہ سسکیاں لے کر رونے لگی۔"(۲۵)

اس ناول میں دو چیزیں خصوصی توجہ کا تقاضا کرتی ہیں ایک اس کا ٹھیٹھ معروضی اُسلوب، دوسری بیزاری کی کیفیت جو ناول کی ہر صورت حال پر حاوی ہے۔ ریاض الرحمن اس ناول کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اس دور میں ذہین لوگوں کی نفسی کیفیت کا یہ معروضی تجزیہ اپنی نوعیت کی ایک اہم کاوش ہے۔ مشاہدے کی گہرائی کی واردات کے اتھلے پن کو قبول کرتی ہے۔ ناول میں جو بدمزہ کسلا ذائقہ پھیلا ہوا ہے۔ وہ قاری کی زبان پر بھی فنی چابکدستی کے ذریعے پہنچ جاتا ہے۔ جس کو کوئی نام نہیں دیا جا سکتا صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔" (۲۶)

فرد اپنے انفرادی جذبے کی بنا پر ہر زمانے ہر عہد میں حالات سے بنرد آزما رہا ہے۔ یوں موضوعیت پرستی کی روایت بھی قدیم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فرد کے ہاں وجودی رویوں کی موجودگی محض فلسفہ وجودیت کے خدوخال اور جدید فکر سے مشروط نہیں بلکہ یہ تو فرد کے ہونے اور ہستی سے مشروط ہیں، اور جب کبھی اس کی ہستی انتشار و اشتراق کی موجودگی سے دوچار ہوتی ہے وہ اپنی ہستی اور ذات کے اثبات پر اصرار کرتا ہے۔ نتیجتاً وجودی رویے سامنے آتے ہیں۔

مذہبی تصورِ وجود:

یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ وجود اپنی ذات میں محدود و مسرود نہیں بلکہ وہ دنیا میں ہے اور لازمی طور پر کسی دوسری شے یا دوسرے وجود سے وابستہ و مستقل ہے مگر وجود کو شعور سے متصف کرنے والی یہی دوسری شے ہے کیا؟ اس ضمن میں دو نقطہ ہائے نظر ہیں ایک مذہبی اور دوسرا دہری۔ ہمارا ملک پاکستان ایک اسلامی جمہوریہ ہے یہاں کا نظام اسلامی اُصولوں کے تابع ہے اور اسلامی اُصول دوسرے مذاہب کے اُصولوں سے مختلف ہیں۔ یہاں ہر شعبہ ہائے زندگی میں اسلامی اصولوں کو مد نظر رکھ کر کام کیا جاتا ہے لیکن ہمارے معاشرے کے افراد چونکہ ایک لمبا عرصہ ہندوؤں کے ساتھ رہے جن کے اعتقادات اسلامی اعتقادات سے یکسر مختلف ہیں۔ صدیوں اکھٹے رہنے کی وجہ سے اس مسلم معاشرے کے لوگوں پر بھی غیر مذہبی اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان غیر مذہبی اثرات کی وجہ سے پاکستانی معاشرہ نا آسودہ نہ ازدواجی زندگی معاشی بدحالی، کشیدہ گھریلو حالات، ادھوری خواہشات اور اسی طرح کی کئی معاشرتی الجھنوں کا شکار نظر آتا ہے۔ جس کے افراد ذہنی و دلی تسکین کے حوالے سے مختلف غیر اسلامی تصورات کا شکار ہو کر بے راہ روی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ انیس ناگی نے معاشرے کے اس کمزور اعتقادی پہلو پر ایک روشنی ڈالی کہ معاشرے کے افراد مختلف ابہام کا شکار ہو کر روحانی تسکین کے لئے معاشرے کے اُن افراد سے رجوع کرتے ہیں۔ جو ایسے لوگوں کی نفسیات کے پارکھ ہوتے ہیں اور مختلف طرح کے ہتکنڈے اپنا کر پیسہ بٹورتے ہیں اور درویشی کا لبادہ اوڑھ کر اپنے مقاصد کی تکمیل کرتے ہیں ناول سے اقتباس پیش ہے:

> "کیا سوچ رہے ہو، پروین نے اسے کہنی مارتے ہوئے کہا یہی کہ میں پڑھ لکھ کر کتنا بے وقوف ہوں اور بیوی کے کہنے پر اس جگہ چلا آیا ہوں جہاں میری تعلیم کی میری عقلیت اور دوسرے شعور کی نفی ہوتی ہے۔ تم فلسفہ کی پروفیسر ہو کر بھی تعویز دھاگوں کے چکر میں ہو شہر میں اس قسم کے پیر فیشن ایبل علاقوں میں بڑی بری کوٹھیاں کرائے پر لے کر لوگوں کا روحانی علاج کر رہے ہیں اور ہر کوئی کہتا ہے کہ اسے پیسے کی لالچ نہیں ہے۔ اگر نہیں ہے تو پھر یہ سارا کاروبار کیسے چلتا ہے۔"(۲۷)

جب معاشرتی اقدار کو زوال آنا شروع ہو جائے اور مذہب معاشرتی زندگی کا ناطہ کمزور ہو جائے تو ایک ایسا خلا پیدا ہو جاتا ہے جس کی تکمیل کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ ناول نگار نے معاشرے کی اس مذہبی

حالت کو جس انداز سے ناول کا حصہ بنایا ہے وہ کافی حد تک حقیقت کے قریب نظر آتی ہے۔ پروین جو جمیل کی بیوی ہے روحانی طور پر انتشاری کیفیت میں مبتلا ہے اس کی معاشی، ازدوجی اور گھریلو زندگی نے اُس کے اُمید کے دامن کو تار تار کر دیا۔ وہ اپنی اذیت کے حصار کو توڑ کر آزاد ہونا چاہتی ہے۔ ناول کے کرداروں کے بارے میں غلام حسین ساجد لکھتے ہیں:

> "سو" پتلیاں" کے کردار دوہری اذیت میں مبتلا ہیں وہ موجودہ پر قانع نہیں رہنا چاہتے اوراس کو بدلنے کی کوشش بھی نہیں کرتے وہ اپنے باطنی حصار کو توڑ کر وقت کے تیز دھارے میں اُترنے کی خواہش بھی رکھتے ہیں اور کسی میں اُترنے اوراپنے بے اعتبار اور بے بس ہوتے چلے جانے کی کیفیت سے آزاد ہونے پر آمادہ بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ظاہری تحرک انہیں موجود کے جبر اور حصار سے باہر لانے کی بجائے اس جال میں مزید اُلجھانے کا باعث بنتا ہے۔" (۲۸)

معاشرے کے اس تضادی پہلو کو جس میں معاشرے کی اکثریت بھی مبتلا ہے ناول نگار نے ایسے پیش کر دیا ہے کہ اگر ارد گرد غورو فکر کیا جائے تو ایسے لگتا ہے موصوف کے تصور کو حقیقت کا جامہ پہنایا ہے۔ چونکہ برصغیر صوفیا کرام کی سر زمین ہے یہاں بہت سارے صوفیا کرام آئے جنھوں نے دین کی تبلیغ کا کام کیا۔ لوگوں کو اخلاقی قدروں سے روشناس کرایا۔ مختلف قسم کی غیر اسلامی ثقافتوں کو دور کر کے دین اسلام کاوہ سیدھاراستہ دکھایا جس کی لوگوں کو ضرورت تھی۔

اس کے بعد مختلف قسم کی افواہوں کا شکار ہو کر معاشرہ ایسے نام نہاد پیروں کے چنگل میں پھنستے چلے گئے، جنہوں نے درویشی کی آڑ میں افراد کی معصومیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مختلف طریقوں سے اقتدار اور پیسہ بٹورنا شروع کر دیا۔ ناول "پتلیاں" میں معاشرے کا یہ رنگ نمایاں نظر آتا ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا ایک جگہ انیس لکھتے ہیں۔ سب لوگ شاہ صاحب کی برکتوں، معجزوں اور پیش گوئیوں کی ثناء خوانی میں رطب السان تھے جمیل نے وہاں یہ سنا کہ شاہ صاحب سرکاری ملازم تھے اور انہیں یہ بشارت ہوئی کہ سرکاری ملازمت بُرا کام ہے۔ وہ حج پر گئے اور آتے ہی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور یاد اللہ میں مصروف ہو گئے اور پچیس سالوں کی مسلسل عبادت کے بعد انہیں بشارت ہوئی کہ لوگوں کی اخلاقی اصلاح ضروری ہے۔

انیس ناگی نے بغور مطالعہ کے بعد معاشرے کے اس پہلو سے خوب پردہ اٹھایا ہے جس میں معاشرے کا ایک حصہ مافیابن کر نہ صرف لوگوں کو ذہنی بیماریوں میں مبتلا کر رہا ہے۔ اپنے جائز و ناجائز مقاصد کی تکمیل کے لئے یہ افراد مذہبی لبادہ اوڑھ کر نہ صرف لوگوں کی جیبوں کو صاف کرتے ہیں بلکہ مختلف قسم کی تخریبی و سیاسی کارروائیوں میں بھی مداخلت کرتے ہیں۔ ناول نگار کے اس موضوع کے چند صفحات کو ہمارے سامنے رکھا ہے لکھتے ہیں:

"میں شاہ صاحب سے ملنے سے پہلے اپنی تسلی کرنا چاہتا ہوں کہ کیا وہ ہماری کچھ مدد کر سکتے ہیں۔ آپ کو شاہ صاحب پر اعتماد ہے ہی تو آپ ادھر آئے ہیں اگر کوئی روحانی مسئلہ ہے تو شاہ صاحب حل کر لیتے ہیں۔ اگر کوئی دنیا کا کام ہے تو شاہ صاحب کے سینکڑوں مرید ہیں شاہ صاحب سائل کی مدد کے لئے ان کے پاس بھیج دیتے ہیں کسی نہ کسی طریقے سے حق رسی ہو جاتی ہے۔" (۲۹)

مذہبی حوالے سے اگر دیکھا جائے تو معاشرے کے افراد کی یہ وجودی صورت غیر مذہبی ہے جس میں اپنی ضرورتوں اور خواہشات کو اللہ کے سوا کسی اور سے چاہنا، چونکہ انیس ناگی مغربی ادیبوں سے بھی متاثر ہے۔ اور اُن کی تحریروں کا عکس موصوف کی تحریروں میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ اس طرح کی وجودیت ہمیں سارتر کے ہاں بھی نظر آتی ہے۔ انیس ناگی نے معاشرے کے ان دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جہاں پر ناول نگار نے معاشرے کے افراد کی کمزور اعتقادی کا بتایا وہاں اللہ پر اعتقاد کے حوالے سے بھی افراد کے رویوں پر بات کی ہے۔ الفاظ پڑھیے جو جمیل اپنی بیوی سے کہتا ہے۔ دفعہ کرو اس پیر کو پھر آ جائیں گے مجھے یہاں سب کچھ مشکوک لگتا ہے مجھے انسانوں پر اعتماد نہیں ہے جو کچھ میرے ساتھ کیا گیا اور جس طرح میں نے فریاد کی کسی نے نہ سنی، ہر انسان بے رحم ہے اور تم ان بے رحموں سے مانگنے آئی ہو۔ چلو یہاں سے چلیں۔

ناول نگار نے مذہب کی آڑ میں چھپے ہوئے برائے نام انسان دوستی کی مالا جھپنے والوں کی تصویر کا دُہرا رخ دکھایا ہے کہ وہ کس طرح سے اپنے آپ کو معاشرے کی نگاہوں سے اوجھل کر کے اپنے اُوچھے ہتکنڈوں میں مصروف عمل رہتے ہیں، اور اپنی دوہری شخصیت کو لوگوں کی نظروں سے اوجھل کر کے ذاتی مفاد کے حصول میں ہوتے ہیں۔ ناول سے اقتباس دیکھیئے:

"شاہ صاحب! آپ کا نام چوہدری اللہ دتہ سابق ایس ایچ او تھانہ پیپلز کالونی
ہے مجھے تم نے پہچانا؟ تم کب سے شاہ صاحب بنے ہو مجھے پتہ چلا ہے کہ تم
خواجہ صاب کے لئے سیاسی کام کرتے ہو، ان کے ووٹ بناتے ہو، کچھ یاد آیا
میں پروفیسر جمیل ہوں جس کا تم نے غلط چالان کیا تھا۔ تم نے مجھے تباہ کیا ہے
شاہ صاحب میں یہ ساری باتیں اپنے اخبار میں لکھوں گا تمہارا سارا ریکاڈ بھی
پولیس کے محکمے سے لے کر چھاپ دوں گا کہ تم نے ایک نابالغ کو پچیس برس
پہلے ریپ کیا تھا اور تمہیں ملازمت سے برخاست کر دیا گیا تھا۔ اب میری
باری ہے میں تمہاری اینٹ سے اینٹ بجادوں گا۔" (۳۰)

ناول نگار اپنی تحریروں میں معاشرے اور اس کے رہنے والوں کے تصورات وحالت کو پیش کرتا ہے۔ کوئی بھی ناول نگار حقیقت سے مکمل طور پر روگردانی نہیں کر سکتا۔ یہی انیس ناگی کا خاصہ ہے انھوں نے معاشرے کو مختلف زاویوں سے پرکھا اور پیش کیا۔ ان کی رائے سے تھوڑا اختلاف تو ممکن ہے مکمل طوپر انحراف ممکن نہیں ہے۔

ب۔ ناول "پتلیاں" کی کہانی میں تصور زندگی

فرد کو زندگی، زمانے اور دنیا کے حوالے سے ہر قدم پر محدودیت اور جبریت کا سامنا رہتا ہے۔ اور یوں قدم قدم پر اس کا یقین و اعتماد متزلزل ہوتا رہتا ہے۔ فرد اوراس کی زندگی بھی بے معنی ہے۔ ناول کے کردار وفور جذبات کی کیفیت میں ڈوب کر خود اپنی پہچان کرنے سے قاصر ہیں ان کی یہ کیفیت اُن کو کسی چیز کا متاشی رکھتی ہے۔ زندگی کے اس جوکھم سے وہ اپنے آپ سے بچھڑے ہوئے محسوس ہوتے ہیں ان کے ہاں تنہائی اور بیگانگی کا احساس جامد و ساکت نہیں ہوتا کہ موجود سے بھی نجات ہی نہ حاصل کر سکے۔ موجود جذبہ اور جوش عمل اُن کو زندگی اور دنیا کے سامنے ڈٹ جانے پر مجبور کرتا ہے۔ انسان وہ نہیں جو کچھ نظر آتا ہے وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے باطن کو ظاہر ہونے سے روکتا رہتا ہے۔ کیونکہ اس میں ممنوعہ کی حد توڑے کا رجحان بڑا قوی ہوتا ہے۔ یہ زندگی بسر کرنے کا ایک سمجھوتہ ہے۔ اس کی تربیت اوراس کی ارد گرد کی دنیا رکاوٹیں پیدا کرتی ہے۔ یہ کشمکش ساری عمر چلتی رہتی ہے وہ کرنے اور نہ کرنے کے تضاد میں رہتا ہے۔ پھر زندگی میں ایک ایسا لمحہ آتا ہے جب عمر اپنا اعلان کرتی ہے اور انسان کہہ اٹھتا ہے بڑھاپے نے آنے میں بہت جلدی کی ہیں اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر نہیں کر سکا میں بہت کچھ کرنا چاہتا تھا لیکن کچھ نہیں کر

سکا۔ میں نے ایک تِتلی کی طرح زندگی بسر کی۔ عمر کے ساتھ ساتھ بظاہر یہ کشمکش ختم ہو جاتی ہے لیکن ایک خلش باقی رہ جاتی ہے کہ وہ سب منشا کے مطابق اپنی زندگی بسر نہ کر سکا اس احساس کے باوجود وہ زندگی کو بسر کرنے کے منصوبے بناتا ہے کبھی خود اور کبھی اپنی اولاد کے ذریعے، صرف صوفی اور فاتح ہی اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

یہ کہنا ضروری ہے کہ وجودیت نے بے شک بیسویں صدی میں اہمیت اختیار کی لیکن وجودی رویئے اس وقت بھی موجود ہیں جب انسان نے شعور و آگہی کی دنیا میں قدم رکھا ہے فرد اپنے انفرادی جذبہ کی بنا پر ہر زمانے ہر عہد میں حالات و واقعات سے بیزار آرہا ہے یوں موضوعیت پرستی کی روایت بھی اتنی ہی قدیم ہے جتنی وجودیت۔ فرد کے ہاں وجودی رویوں کی موجودگی محض فلسفہ وجودیت کے خدوخال اور جدید فکر سے ہی مشروط نہیں، بلکہ یہ تو فرد کے ہونے اور ہستی سے مشروط ہے۔

تصور زندگی کے بارے مین انیس ناگی لکھتے ہیں:

> "آدمی وہ نہیں ہے جو کچھ ہے وہ اپنے ماضی کو ایک سائے کی طرح اپنے ساتھ لے کر چلتا ہے ہر شخص اپنے طور پر ایک واقعہ ہوتا ہے جسے وہ اپنی زندگی کی کہانی میں منتقل کرتا ہے۔"(۳۱)

ناصرف برصغیر کے شعراء بلکہ مصنفین کے ہاں بھی وجودی رویوں اور انداز فکر دونوں عوامل کارفرما تھے۔ یعنی جدید فکری اور فلسفیانہ تربیت اور جانکاری اور حالات واقعات کا شاعری اور ناول دونوں میں رہا۔ ناول میں موضوعیت پسند رویوں کا رجحان بھی ہے۔ اردو ناولوں میں معاشرتی سوچ شعور اور آگہی ملتی ہے فرد کے رویے اور جذبات بھی زیر بحث رہے ہیں اور آج بھی ان پر لکھا جا رہا ہے انیس ناگی کے ناولوں میں جہاں بہت سارے رویوں کا پتہ ملتا ہے وہاں فرد کے جذباتی و نفسیاتی تصور کو بھی باخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ ناول نگار افراد معاشرہ کی نفسیات کی مختلف پرتوں کو کھولتا ہے انسان اور معاشرہ کے تعلق اور ان کے مابین ہونے والی رسہ کشی کو یوں بیان کرتا ہے:

> "کون کہتا ہے کہ انسان آزاد ہے انسان حالات کی جبریت میں ہے وہ اس سے بچنے کا راستہ نکالتا ہے آپ کا راستہ کچھ اور ہے اور میرا کچھ اور۔" (۳۲)

ناول نگار معاشرہ کے متضاد رویوں کا تذکرہ فلسفیانہ انداز میں کرتا ہے جس سے معاشرتی زندگی میں افراد کی دوہری شخصیات سامنے آتی ہیں۔ موصوف ایک ماہر قلم کار ہونے کی شخصیت سے مختلف احساسات کی ان گھتیوں کو اپنے انداز میں بیان کرتا ہوا ایک ایک کر کے سامنے لاتا ہے۔

انیس ناگی نے انسان کی شخصیت کی تہوں اور ان کی کراہت اور فریب کو پرکھا اور اپنے فلسفیانہ انداز میں کردار کو بیان کیا۔ناول نگار معاشرے کے بہت سارے پہلوؤں کا پارکھ معلوم ہوتا ہے جہاں اس نے بہت سارے معاشرے پہلوؤں پر بات کی وہاں ازدواجی زندگی کے حوالے سے بھی ایک ماہر قلم کار دکھائی دیتا ہے جو مرد و عورت کے تصورات واحساسات پر بھی رائے دیتا ہے کہ:

"ہر مرد عورت کے بارے میں ڈان جان ہوتا ہے وہ ایک عورت سے دوسری عورت کی طرف جاتا ہے اور پھر بھی غیر مطمئن رہتا ہے ڈیر زندگی جس طرح ہے اسے بسر کرو اسے چیلنج مت کرو ورنہ۔۔۔ خیر زندگی اور انسان کے اندر اترنے کی کوشش نہ کرو ایک گھناونا پن دکھائی دے گا۔" (۴۳)

ناول "پتلیاں" میں ناول نگار نے ہمارے معاشرتی تضاد پر بہت سی مثالوں کے ذریعے روشنی ڈالی ہے۔ موصوف نے عورت مرد کے حوالے سے ہمارے معاشرے کے افراد کے تصور زندگی کو پیش نظر رکھ کر لکھا ہے کہ یہی تو آئرنی ہے مرد کو عورت کی خواہش ہو تو وہ کسی عورت کے ساتھ سو سکتا ہے اس کا زیادہ برا نہیں منایا جاتا اگر عورت میں خواہش پیدا ہو تو یہ ضروری سمجھا جاتا ہے کہ وہ اپنے خاوند کے علاوہ کسی اور مرد کے ساتھ نہیں سو سکتی۔ اگر وہ ایسا کرتی ہے تو لوگ اسے بد معاش اور گشتی کہتے ہیں یہ کیا بات ہوئی اگر آدمی بد معاش ہو سکتا ہے تو عورت کیوں نہیں؟

مرد مادی جسم رکھنے کے باوجود محض مادہ نہیں اور نہ ہی کسی دوسری مادی شے سے مماثلت رکھتا ہے سو انکار اس کے وجود کا لازمی حصہ ہے کیونکہ وہ دنیا اور دنیا کی مادی اشیا کا نہ تو حصہ ہے اور نہ ہی شے وہ جامد و ساکت بھی نہیں ہے بلکہ اس کے من میں ہمہ وقت جوش عمل اور تگ و تاز کے الاو روشن رہتے ہیں سو وہ دونوں اشیا اور معاشرے کا حصہ نہ بننے اور نہ ہونے پر مصر رہتا ہے یہی انکار اسے وجود سے متصل کرتا ہے۔ ہر شخص اپنے طور پر ایک وجود ہے ہر وجود ایک مسئلہ ہے خود اپنے لیے اور دوسروں کے لیے مسئلہ تو دراصل جینے اور مرنے کا ہے مرنا آسان ہے جینا مشکل خاص طور پر ان خطوں میں جہاں زندگی ایک بار ہو جہاں ہر ذی نفس دوسرے کو فریب دینے کے لیے ہر وقت تیار ہو جہاں اضطراب میں رہنا ایک دائمی صورتحال ہو

اضطراب ظاہر ہے زیادہ باطن میں ایک کیڑے کی طرح خاموشی سے لہو پیتا رہتا ہے۔ پھر ایک دن ایسا فرد اپنے مصنوعی رویوں کے حوالے سے اپنے آپ کو منوانے کے لیے سر کرداں رہتا ہے ایسے میں معاشرہ فطرت اور زمانہ اور موت اس کی راہ میں رکاوٹ بن کر سامنے آتے ہیں فرد حدود و قیود کو پھلانگ جانا چاہتا ہے زندگی کی تمام حدود و قیدد کو توڑنے اور پھلانگنے کی یہ کوشش جو فرد کی موضوعیت سے جنم لیتی ہے آزادی ہے یہ آزادی زندگی کی کیفیات اور صورت حال سے بھی متعلق و متصل ہوتی ہے اور فرد کی موضوعی جہد اور جوش عمل سے بھی فرد کبھی بھی زندگی کی طے شدہ کیفیات اور طے شدہ اقدار جن کی وجہ سے ایک خاص صورت حال جنم لیتی ہے کو تسلیم نہیں کر سکتا سو وہ بغاوت کرتا ہے۔ انیس ناگی تصور زندگی کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

> " انسان امید کے سہارے جیتا ہے یہی اس کو حوصلہ اور ہمت دیتی ہے اس کے برعکس زندگی نے اسے بتایا تھا کہ امید ایک سراب ہے اور انسان اسی سراب میں رہ کر زندگی کا سوئمبر رچاتا ہے زندگی کی بے مصنوعیت سے بچنے کے لیے چھوٹی چھوٹی خوشیاں ایجاد کرتا ہے وہ اپنی تنہائی سے اور اس دنیا میں انسانی بیگانگی سے بچنے کے لیے طرح طرح کے ہدف مقرر کرتا ہے تیسری دنیا بے امید کی دنیا ہے جہاں انسان پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ مطلبی ہے۔" (۴۴)

تاریخ شاہد ہے کہ عقل اخلاق اور مذہب کی زنجیروں میں جکڑا بے توقیری اور مجبوری کے خوف میں مبتلا انسان ہمیشہ اپنی ذات کے اثبات اور اپنی بقا کے لیے سرگرداں رہا ہے اور اس نے اپنے موضوعی تیقن اور اعتماد کے سہارے اپنے من میں بھڑکتے آزادی کے الاو کے توسط سے زندگی کی محرومیوں اور اسیریوں کو شکست دے کر زندگی کو نیا مفہوم دینے کی کوشش کی ہے۔ ناول پتلیاں کے کردار ہمارے معاشرے کے عکاس ہیں جن کو قدم قدم پر مجبوری اور محرومی کا سامنا ہے ان کے من میں زندگی مچلتی ہے ایک موضوعی اعتماد اور جدوجہد انہیں مجبوریوں اور محرومیوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے پر اکساتی رہی۔

معاشی تصور زندگی:

انیس ناگی کا یہ ناول وجودی حوالے سے خاصی اہمیت کا حامل ہے اس ناول کے تمام کردار بوجھل تھکی ہوئی بے ثمر زندگی کا بوجھ اٹھاتے وقت کے ہاتھوں میں پتلیاں بنے نظر آتے ہیں جس کی ڈور حالات کے ہاتھ میں ہے حالات ہمیشہ انسان سے طاقتور رہتے ہیں زندگی بذات خود کسی عذاب سے کم نہیں ناول کا آغاز چار

پڑھے لکھے نوجوانوں سے ہوتا ہے جس کی زندگی بذات خود کسی عذاب سے کم نہیں وہ زندگی کی مشقت کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں اگرچہ وہ ڈاکٹر اور انجینئر ہیں مگر پھر بھی ان کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ایک انتشار اور بد حواسی ان کے رگ و پے میں پھیلتی ہی جارہی ہے وہ اپنی معاشی حالت کو بہتر بنانے کے چکر میں ہیں اس کے لیے وہ ہر جائز اور ناجائز طریقہ اپنانے کے لیے تیار ہیں ناول نگار نے ان کرداروں کے ذریعے سے تصور معاش کو ہمارے سامنے رکھا ہے کہ جب معاشرہ غربت بیروزگاری اور لوٹ مار کا شکار ہو تو صرف غریب طبقہ ہی نہیں بلکہ اہل ثروت بھی مال و دولت کے حصول کے لیے ہر حربہ اپناتے ہیں ناول نگار معاشی تصور زندگی کے بارے اپنے ناول پتلیاں میں لکھتے ہیں:

"میں نے ابھی تک حالات کے ہاتھوں پتلی بننے سے انکار کیا ہے لیکن میری صورت حال نہیں بدلی اگر میں اس نظام کو قبول کر لوں تو بھی معاملات اسی طرح رہیں گے کون سی ایسی طاقت ہے جو مجھے کچھ کرنے اور نہ کرنے پر مجبور کر رہی ہے میں فیصلہ کرنے کی ہمت رکھتا ہوں اگر فیصلے کے باوجود صورتحال نہیں بدلی تو ایسے فیصلے کا کیا فائدہ دنیا کی سب سے بڑی دولت ہے اسی سے سارے معاملات شروع اور ختم ہوتے ہیں۔" (۳۵)

ناول نگار نے اس معاشرے کے معاشی پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے افراد معاشرہ کے معاشی تصور کو بخوبی بیان کیا ہے کہ مختلف محکموں میں ملازمت کے حصول کے لیے جانے والے افراد یہ سوچ کر انتخاب کرتے ہیں کہ یہاں سے مال و دولت وافر مقدار میں مل سکتی ہے یا نہیں ناول نگار کے اس تصور سے کسی حد تک اتفاق کیا جاسکتا ہے کیونکہ جس معاشرے میں ہم رہ رہے ہیں وہاں معاشی فکر افراد سے ناجائز اور جائز معاشی حصول کا کام لیتی ہے خصوصی طور پر نوجوان طبقہ اس سے بے حد متاثر نظر آتا ہے ایک جگہ انیس لکھتے ہیں۔ امجد مقابلے کے امتحان کے نتیجے سے مطمئن نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ڈی ایم جی گروپ میں آجائے گا اور اس کے ارد گرد کی دنیا بدل جائے گی وہ اپنی ہر خواہش کو پورا کرے گا سرکاری خرچ پر باہر ٹریننگ کے لیے جائے گا ہر کام ٹیلفیون پر ہو جائے گا حسب منشا پوسٹنگ ملے گی سیاسی حکمرانوں کا قرب حاصل کر کے وہ اپنی زندگی کو ایک نعمت میں بدل دے گا اس خواہش کے دباو اور مسلسل بیروزگاری نے اسے اپنا کیریئر تبدیل کرنے پر مجبور کیا تھا۔ اس بے اطمینانی میں اسے ایک اطمینان بھی تھا کہ وہ جلد ہی ایسے مقام پر پہنچ جائے گا جہاں وہ حسب منشا دولت کما سکے گا۔

انیس ناگی نے مختلف پیشوں سے وابستہ افراد کی معاشی سوچ کا احاطہ کیا ہے کہ معاشرہ کس طرح اپنے پیشے کی آڑ میں مال و دولت کی فراوانی چاہتے ہیں وہ اپنے پیشے کی اہمیت اور تقدس کو پامال کرنے کی کوئی کسر باقی نہیں چھوڑتے اسی طرح کی سوچ کی عکاسی کرتا ہوا ایک اقتباس پیش ہے۔

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی تم نے امریکہ امریکہ کی کیا رٹ لگائی ہوئی میں روپے پیسے کے بارے میں تم سے زیادہ کمینہ ہوں میں ڈاکٹر ہوں نوٹوں کا کیا ہے موقع ملا ہے دل بھر کے بنالیں گے صرف ہمت ہونی چاہیے" (۳۶)

معاشی فکر کے حوالے سے ناول نگار ناول پتلیاں میں مختلف محکموں کے حوالے سے افراد کی سر گرمیوں پر روشنی ڈالتا ہے کہ وہ کس طرح زیادہ پیسے کی ہوس میں مصروف عمل رہتے ہیں۔

صحافت کے پیشہ کو سامنے رکھتے ہوئے ناول نگار کے تصور کو اگر دیکھا جائے تو یہ حقیقت کے قریب نظر آتا ہے کہ صحافت میں بھی ایسے افراد کا عمل دخل ہے جو اس پیشے کی آڑ میں اپنی معاشی تشنگی کو دور کرتے ہیں اقتباس دیکھئے:

"اس نے کئی مرتبہ علی کو مشورہ بھی دیا ہے کہ اخبار میں چند کالمسٹ اخبار کے مفاد کے خلاف کام کر رہے ہیں ان میں سے تین لیکچرز ہیں جو اپنی بیویوں کے ناموں پر تنخواہ لیتے ہیں صبح ایک آدھ کلاس لے کر سارا دن اخبار میں کام کرتے ہیں ان میں نہ تو اہلیت ہے اور نہ ٹیلنٹ وہ ہر وزیر اور بڑے افسر کی خوشامد کرتے ہیں اخبار کے زریعے ادیب بن کر انعامات حاصل کرتے ہیں ایسے لوٹوں کو اخبار سے نکال دینا چاہیے" (۳۷)

ناول میں معاشرے کے دولت مند طبقہ کے تصور معاش کے حوالے بھی ملتے ہیں کہ عوامی خدمت کی آڑ میں وہ چور دروازوں سے کس طرح دولت حاصل کرتے ہیں جس کا کچھ حصہ عوام پر خرچ کر کے خوب نمائش کرتے ہیں اور باقی کو اپنے ذاتی مفاد کے لیے دبا لیتے ہیں اس ظاہری نمود و نمائش کے حوالے سے ناول نگار لکھتے ہیں۔ بہت سے بیورو کریٹس جن کی بیویاں اس NGO کی روح رواں ہیں ان کی خواہش ہے کہ انہیں ہائی لائٹ کیا جائے کہ انہوں نے غریبوں اور مسکینوں کی فلاح کے لیے بہت کچھ کیا ہے "مائی فٹ یہ غیر ملکیوں سے پیسے بٹورنے کے طریقے ہیں اس وقت ملک میں دو ہزار کے قریب NGO کام کر رہی ہیں؟ صرف

گرانٹوں کو خرد برد اور بیرونی دورے۔ناول کی فضا میں ایک انتشار اور بد حواسی ہے جو پھیلتی ہی چلی جاتی ہے ایک طرف تو معاشرتی قدروں کا تصادم ہے دوسری طرف بے چہرگی اور گھٹن کا احساس ہے جو ہر وجود پر حاوی نظر آتا ہے۔

سماجی و سیاسی تصور زندگی:

برصغیر کے بہت سارے لکھاریوں نے یہاں کے حالات و واقعات کے ذریعے سے ملکی سیاست اور اس کے گور کھ دھندوں کو اپنی تحریروں کا حصہ بنایا خصوصا شاعر لوگ تو اس سے بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں برصغیر کے سیاسی حالات صدیوں سے ابتر رہے ہیں جن کی اصلاح کے لیے ہمارے قلمکاروں نے اپنے قلم کو خوب آزمایا ہے شاعروں نے اشارے اور کنائے سے اس موضوع کو خوب بیان کیا کچھ شاعروں نے سپاٹ لہجے کا سہارا بھی لیا جس کے لیے ان کو قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑی ناول نگاروں نے بھی معاشرتی و سیاسی صورت حال اور اس کی ابتری کو اپنا موضوع تحریر بنایا۔انیس ناگی کے ناول پتلیاں میں بھی ہماری خراب سیاسی و معاشرتی صورت حال کے بارے میں اشارے ملتے ہیں جیسا کہ یہ امجد کی ماں پروین کی سرکاری رہائش گاہ ہے جو اس نے بڑی تگ و دو کے بعد حاصل کی ہے وہ جس نظام میں کام کرتی ہے وہاں ہر کام انڈر ہینڈ کیا جاتا ہے ایک محتاط رائے کے مطابق یہ دینا کی سب سے بدنام انتظامیہ ہے جس کے قول و فعل میں کوئی ربط نہیں ہے یہ ہمیشہ سیاسی عمل اور ذاتی اغراض کے تحت کام کرتی ہے اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہاں ہر کام سفارش اور رشوت سے سیدھا ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ لوگ دن دہاڑے ایک دوسرے کو قتل کرتے ہیں یا ایک دوسرے کی املاک پر قبضہ کرتے ہیں قانون کو بے اثر کرنے کے لیے اپنی مرضی کے افسر لگائے جاتے ہیں۔یہ سب اس شہر کی معمولات کا حصہ بن چکا ہے اور شہریوں کو ایسے کاموں پر حیرت نہیں ہوتی اس ابتر صورتحال پر ایک اخبار نے ایک دو مناظرے بھی کرائے ہیں لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا سیاستدان کہتے ہیں کہ ساری خرابی بیوروکریسی نے پیدا کی ہے جو انگریز کی پیدا کردہ ہے جو ہر شہری کو غلام سمجھتی ہے بیوروکریٹس کہتے ہیں کہ خرابی کی اصل جڑ سیاستدان ہیں جنھوں نے قانون کی بالادستی ختم کر دی ہے

۔

پاکستان بننے کے ساتھ ہی ملک سیاسی عدم استحکام پیدا ہو گیا جس کے نتیجے میں سماج شکست و ریخت کا شکار ہو کر بے عملی دوزخ گوئی اور بے گانگی میں ڈوبتا چلا گیا معاشرہ واضح طور پر دو طبقات میں تقسیم ہو گیا ایک

صاحب اقتدار طبقہ اور دوسرا بے قرار عوام کا حکمران طبقے کے لوگ اپنے آپ کو ضابطے اور قانون سے ماورا سمجھنے لگے ایم این اے اور ای پی اے حضرات نے سیاسی رشوت اندوزی اور معاشرے کی جملہ برائیوں کو فروغ دینے میں کوئی کسر نہ اٹھار کھی ناول نگار نے سیاسی ابتری کو کچھ یوں بیان کیا ہے:

"گزشتہ دس پندرہ برسوں سے حالات بیحد غیر یقینی تھے جمہوریت کے نام پر سیاسی جماعتوں نے فسطائیت کا در کھولا تھا لوٹ کھسوٹ قتل و غارت ہر طرح کے قانون کو روندنا املاک حاصل کرنے کا جنون یہاں کی اجتماعی شخصیت کا نمایاں وصف بن چکا تھا مہنگائی آسمان پر تھی آمدنی اور خرچہ کے درمیان بڑی خلیج تھی اس خلفشار میں سکون حاصل کرنے کا واحد طریقہ زیادہ سے زیادہ اولاد پیدا کرنا تھا لوگ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر بدلتے ہوئے سر براہوں کی طرف دیکھتے تھے افواہوں کا بازار گرم تھا سب کچھ متوقع ہوتے ہوئے بھی غیر متوقع تھا"[۳۸]

اگر موجودہ صورت حال کو دیکھا جائے تو سرکاری سطح پر سب مل کر عوام کو لوٹ رہے ہیں عوام اپنی آزادی پر نوحہ کناں ہے بیوروکریسی اور سیاستدانوں کا گٹھ جوڑ ملک کو اندھیر نگری کی طرف لے کر جارہا ہے جب ایسے حالات ہوں تو عوام بے راہ روی کا شکار ہو کر معاشرتی سطح پر عدم تحفظ محسوس کرتی ہے۔ناول نگار نے ہمارے معاشرے کی منافقانہ روش ریاکاری اور دغابازی کے رویے اخلاقی و اقداری پامالی کو اپنے اس ناول میں واضح طور پر بیان کیا ہے ملک کی بگڑی ہوئی معاشرتی و سیاسی صورت حال بھی ناول کا موضوع ہے جس کے کئی گوشے بے نقاب کئے ہیں انیس ناگی لکھتے ہیں:

"اسے یوں لگا کہ تعلیم کے پیشے میں زیادہ تر لوگ مجبوری کی وجہ سے آئے ہیں اگر کہیں ملازمت نہیں ملتی اور ایم اے کی ڈگری پاس ہے تو لیکچرر کی آسامی مل سکتی ہے جمیل پڑھائی میں کافی تیز تھا وہ چاہتا تو مقابلے کا امتحان آسانی سے پاس کر سکتا تھا لیکن اس نے اجتناب کیا ہوا یوں کہ چند سالوں کی ملازمت کے بعد اسے پتہ چلا کہ تدریس کے پیشے اور ہلدی بیچنے میں زیادہ فرق نہیں اکثر لیکچرر گائیڈیں لکھنے میں مصروف ہیں بعض نے امتحانی پرچے چوری کر کے انھیں گیس پیپر کے طور پر فروخت کرتے ہیں کوئی پیسے لے کر امتحان میں نمبر بڑھا رہا ہے۔"[۳۹]

جب کسی معاشرے میں سیاسی و سماجی حالات ابتر ہو جائیں تو افراد کا یقین و اعتماد بھی متزلزل ہو جاتا ہے اور بے ثباتی ناپائیداری کا احساس جنم لیتا ہے افراد اپنے آپ کو مغائرت کا شکار محسوس کرتے ہیں۔ انیس ناگی اپنے اس ناول میں اس معاشرے کی سیاسی و سماجی ابتری کو اتنے آسان اور پر اثر الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ قاری اس کے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ حقیقت میں ایسی صورت سے افراد گزر رہے ہیں اور سیاسی اثر و سوخ اسی طرح سے مختلف اداروں کو اپنی گرفت میں لے کر بگاڑ کا سبب بن رہا ہے:

انیس ناگی شعبہ صحافت کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

> "پیارے صحافت تو ہے ہی یہی جو سب کچھ داو پر لگانا پڑتا ہے میں نے بہت مدت بعد غیر جانبدار رہ کر دیکھ لیا ہے ہاں سنو ایک دو زور دار کالم خواجہ کی حمایت میں لکھو میں نے تمہارے مکان کا مسئلہ بھی اسی سے مل کر حل کروانا ہے ان کی پارٹی کا منشور ان سے لے لو اور یہی ثابت کرنے کی کوشش کرو کہ خواجہ ہی اس ملک کا مقدر بدل سکتا ہے ڈیم شٹ تمہیں پتہ ہے کہ خواجہ نے کس طرح زمیں حاصل کی ہیں۔ کس طرح کارپٹ فیکڑیاں لگائی ہیں لیکن ہم نے کہنا ہے کہ سب اچھا ہے۔"[۴۰]

انیس ناگی نے جہاں بہت سے معاشرتی پہلووں پر روشنی ڈالی ہے وہاں ایک پہلو نوجوان پڑھے لکھے طبقے کا بھی ہے جو حالات اور بیروگاری سے تنگ ہے اور اعلیٰ تعلیم ہونے کے باوجود اس ملک میں بتر وسائل میسر نہیں ہیں۔ بیسوی صدی کے آغاز سے ہی برصغیر کے حالات خراب ہو گئے تھے یقین اور اعتماد منزلزل تھا اور اثبات ذات کا سوال ہی شدو مد سے موجد تھا حالات خراب سے خراب ہوتے گئے جس کے نتیجے میں معاشرے پر اور اس کے افراد پر اس کے برے اثرات پڑے۔

ناول نگار نے اپنے اس ناول میں جگہ جگہ مغرب کے اثرات کا ظاہر کیا ہے معاشرے نے مغرب کی تقلید میں اپنے طرز زندگی کو بدلنا شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ روش خاص طبقے سے عام طبقے تک پہنچی ترقی کی دوڑ زیادہ پیسے کی ہوس اور ملازمت کے حصول نے اسلامی قدروں کو پس پشت ڈال دیا مخلوط نظام کی پیروی نے معاشرے میں بہت سارے مسائل کو جنم دیا ناول نگار کے الفاظ دیکھئے:

> "پہلے مقابلے کے امتحان صرف مردوں کے لیے تھے پھر عورتوں کے لیے بھی کھل گئے شروع شروع میں حسب ممول ہر طبقے نے مخالفت کی پھر دیکھتے

ہی دیکھتے ہر چھوٹے بڑے خاندان کی لڑکی جو اچھی شکل سے محروم تھی یا جن
کے مالی حالات مخدوش تھے۔ خواہ وہ ڈاکٹر تھی یا انجینئر یا لیکچرر دھڑا دھڑ
مقابلے کے امتحان میں اچھی پوزیشن لینے لگیں وہ جو عورتوں کو گھر کی زینت
کی تبلیغ کرتے تھے وہ اسلامی تاریخ سے مثالیں دینے لگے کہ عورتوں کو
مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنا چاہیے۔"(۴۱)

معاشرتی اور سیاسی نظام کو ناول نگار نے اپنے ناول میں خوب برتا ہے اور ان سے پیدا ہونے والی برائیوں اور اس کے برے اثرات سے پیدا ہونے والے حالات کی سنگینی کو بھی واضح کیا ہے مختلف پہلوؤں کا باریک بینی سے مشاہدہ نہیں کیا گیا بلکہ کچھ خاص نقطے واضح کرنے پر ہی اکتفا کر لیا گیا ناول نگار کے خیالات کو مکمل معاشرے کے حوالے سے پرکھنا درست نہ ہو گا۔ بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ معاشرہ ایسے وجودی تصورات کا کچھ تک تاثر دے چکا ہے۔

ج۔ ناول "پتلیاں" کی کہانی میں تصور موت

انسان ماضی کے حوالے سے اپنی زندگی کے آغاز کے لمحے کا تعین تو کر سکتا ہے مگر اپنے انجام یعنی موت کے لمحے کا تعین کرنا اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس حوالے سے مستقبل ہمیشہ تاریکی میں دوبارہتا ہے مگر موت ناگزیر اور ناگہاں ہے اور فرد اس کے سامنے بے بس ہے۔ لہذا کوئی نہیں جانتا کہ اس کے منصوبے پروان چڑھیں گے یا نہیں اور یوں موت فرد کے لے ایک کرب کا پیغام بن جاتی ہے تبھی تو غالب نے کہا تھا۔

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

اسی لیے کہا بالکل بجا ہے کہ موت ایک وجودیاتی مسئلہ ہے وجودی فلسفہ کے نزدیک موت خالصتا" ایک انفرادی مسئلہ اور جذباتی کیفیت ہے جو وجود کو اس کے ہونے کا پتا دیتی ہے مگر امکان محض مقدر کا لکھا اچھائی یا برائی نہیں بلکہ یہ ہمیشہ وجود کے انتخاب سے متصل ہو کر اچھائی میں ڈھل جاتا ہے۔

انیس ناگی کے ناول پتلیاں میں وجودی فلسفہ جگہ جگہ نظر آتا ہے جس پر زمانی اثرات کو بھرپور طریقے سے دیکھا جا سکتا ہے کردار اپنی معاشرتی زندگی میں اس طرح سے مگن اپنے اپنی وجودی تصورات کے ساتھ جڑے محو سفر ہیں کہ دنیا سے ہٹ کر سوچنا ان کے لیے محال دکھائی دیتا ہے لیکن ایک حقیقت سے چشم

پوشی نہیں کی جاسکتی وہ موت ہے ناول کے کچھ کرداروں کے ہاں اس کا تصور موجود ہے آیئے ایک مختصر سا اقتباس دیکھتے ہیں:

"ملاقاتوں کا یہ سلسلہ زیادہ تواتر اختیار کرنے لگا تھا جمیل خود اس سے کچھ پریشان تھا وہ انجام سے ڈرتا تھا وہ عمر کے اس حصے میں تھا جہاں سے زندگی سے دست برداری اپنے کردہ اور ناکردہ گناہوں کی معافی کا عمل شروع ہوتا تھا۔"(۴۲)

تصور موت ہی انسان کو اس راستے کی طرف موڑتا ہے جس پر چل کر وہ اطمینان سکون کو لے کر انتشاری کیفیت سے نکل آتا ہے۔ یہ صورت حال بسااوقات امکانات کی تحدید کا باعث بنتی ہے دوسری طرف خود وجود بھی زمانیت اور صدرت حال کا اسیر ہونے کے باعث محدودیت کا سامنا کرتا ہے سو مکانات وسعت اور ہمہ گیری کے باوجود ایک تحریر کا شکار ہوتے ہیں مگر وجود اپنے یقین ذات اور جہد و عمل کے حوالے سے اپنے تین اس تحریر کو تسلیم نہیں کرتا نتیجتا" وہ ہمہ وقت انتخاب کے عمل سے گزرتا ہے اس کے من کی بے کرانی اور قوت ارادی اسے یقین اور اعتماد بخشتے ہیں۔ انتخاب وجود کی مجبوری سے کیونکہ انتخاب سے پہلے ذات کا وجود نہیں ہوتا بلکہ ذات انتخاب کے توسط سے وجود میں آتی ہے یوں کہہ لیجئے کہ انتخاب نہیں کرتا بلکہ ہمیشہ ایک کامل یا مطلق انتخاب میں بطور کامل نہیں کر سکتا فرد کا وجود مختلف تصورات کے سہارے رہتا ہے کبھی اسے کوئی تصور گھیرے ہوتا ہے اور دوسرے لمحے کوئی اور وجود ان موضوعات سے مل کر عمل کی طرف سفر کرتا ہے۔ پاکستانی معاشرہ ایک اسلامی معاشرہ ہے اس کی اقدار عوامل اور عناسر افراد معاشرہ کو جہاں بہت ساری حقیقتوں سے آگاہ کرتے ہیں وہان ایک حقیقت موت بھی ہے اور اس کے بعد آنے والی زندگی بھی ہے موت کے بعد دنیامیں کئے گئے اعمال کا حساب یوم آخرت کو ہو گا اسلامی معاشرے میں اس بات کو عقیدے کے طور پر مانا جاتا ہے دوسرے کئی مذاہب میں بھی موت کے بعد کا تصور کسی نہ کسی صدرت میں موجود ہے اسلامی معاشرے کے افراد اسلامی حدود وقید کو مد نظر رکھتے ہوئے دنیاوی معاملات کو حل کرتے ہیں انیس ناگی کے ناول "پتلیاں" کے کردار اسلامی معاشرے کے کردار ہیں اس لیے ان کے ہاں موت اور یوم حساب کا تصور موجود ہے جو ناول میں کچھ اس طرح ملتا ہے۔

"البصار تم اچھی بات کرتے ہو جو میری سمجھ میں آرہی ہے لیکن اپنے یوم حساب سے ڈرو"(۴۳)

ناول نگار نے معاشرے میں وجودی کشمکش کے مختلف پہلوؤں کو بیان کرنے میں موثر انداز اپنایا ہے اس ناول میں تمام کردار بوجھل، تھکی ہوئی بے ثمر زندگی کا بوجھ اُٹھائے وقت کے بے رحم ہاتھوں میں پتلیاں بنے نظر آتے ہیں۔ جس کی ڈور حالات کے ہاتھوں میں ہے اور حالات ہمیشہ انسان سے زیادہ طاقتور ہوتے ہیں۔ زندگی ان کے لیے بذات خود کسی عذاب سے کم نہیں۔ ناول کا مرکزی کردار ایک ایسا فرد ہے جو سچائی کے ساتھ اپنی مرضی سے زندہ رہنا چاہتا ہے وہ انصاف پسندی کی قدروں کے ساتھ اپنی شخصیت کو ایک مکمل انسان کی حیثیت سے محسوس کرنا چاہتا ہے لیکن بد قسمتی سے آپس کے سامنے جو معاشرہ ہے وہ ان قدروں کا حامل نہیں ہے اس فرد کا سامنا جس نظام سے ہوتا ہے اس میں غیر جمہوری رویے، غیر منصفانہ سماج منافقت پر مبنی سوسائٹی اور بے ایمانی کا کلچر ہر طرف پھیلا ہوا ہے۔ پورے سماج میں وہ اکیلا ہے اس لیے نہ تو اس نظام کو بدل سکتا ہے اور نہ بدلنا چاہتا ہے۔ ناول کا آغاز چار پڑھے لکھے مگر بے روزگار نوجوانوں کی آپس میں گفتگو سے ہوتا ہے امجد، احمد ابرار اور انور زندگی کی مشقت اور بوجھ تلے خود کو محسوس کرتے ہیں اگرچہ وہ ڈاکٹر اور انجینئر ہیں مگر پھر بھی ان کے لئے کوئی جائے پناہ نہیں۔ ایک انتشار اور بدحواسی ان کے رگ وپے میں پھیلتی ہی چلی جارہی ہے، ایک طرف وہ اپنی بے روزگاری سے نالاں اور دوسری طرف معاشرتی قدروں سے تصادم، تمام نوجوان اپنی شناخت چاہتے ہیں مگر بے چہرگی اور گھٹن ان کے سامنے دیوار کی طرح کھڑی ہے۔

حوالہ جات

1۔ سی اے قادر، ڈاکٹر "وجودیت" مشمولہ: "ادب فلسفہ اور وجودیت" مرتبہ: شیما مجید نعیم احسن نگارشات لاہور، ۱۹۹۱ء، ص۲۸۷

2۔ بختیار حسین صدیقی، وجودیت کیا ہے، مشمولہ "وجودیت" مرتبہ: جاوید اقبال ندیم، ص۳۲

3۔ قاضی جاوید، مترجم: "وجودیت اور انسان دوستی" نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور، س ن، ص۷

4۔ انیس ناگی، ڈاکٹر، "پتلیاں"، گنگارام فیشن مال روڈ، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص۱۱

5۔ سی اے قادر، ڈاکٹر، وجودیت، مشمولہ "ادب فلسفہ اور وجدیت" ص۲۰۸

6۔ انیس ناگی، ڈاکٹر، پتلیاں، ص۵۱

7۔ ایضاً، ص۵۱

8۔ ایضاً، ص۸۲

9۔ ایضاً، ص۹۳

10۔ ایضاً، ص۲۴

11۔ جاوید حسین قاضی، وجودیت، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، ۱۹۷۳ء، ص۱۱

12۔ ایضاً، ص۸۷

13۔ انیس ناگی، ڈاکٹر، پتلیاں، ص۹۹

14۔ سی اے قادر، ڈاکٹر "وجودیت" مشمولہ: "ادب فلسفہ اور وجودیت" مرتبہ: شیما مجید نعیم احسن نگارشات لاہور، ۱۹۹۲ء، ص)

15۔ رضا عابدی، ساتر کا وجودی ڈرامہ، مشمولہ: "ادب فلسفہ اور وجودیت" ص۲۹۱

16۔ ایضاً، ص۱۴۶

17۔ ایضاً، ص۱۴۸

18۔ ایضاً، ص۹۱

19۔ ایضاً، ص۸۵

20۔ ایضاً، ص۱۳۵

21۔ ایضاً، ص۱۳۶

22۔ ایضاً، ص۱۳۸

23۔ ایضاً، ص۱۴۳

24۔ ایضاً، ص۱۹۶

25۔ ایضاً، ص۱۷۴

26۔ ریاض الرحمن ساغر، ناگی مر گیاناگ آزاد، مشمولہ ”روزنامہ نوائے وقت، لہاور، ۱۰۱ اکتوبر ۲۰۱۰ء

27۔ انیس ناگی، ڈاکٹر، پتلیاں، ص ۱۱۴

28۔ غلام حسین ساجدی، مشمولہ: سہ ماہی دانشور، انیس ناگی نمبر، مدیر عفت انیس، لاہور بک ہوم، ۲۰۱۱ء، ص۱۱۸

29۔ انیس ناگی، ڈاکٹر، پتلیاں، ص ۱۱۴

30۔ انیس ناگی، ڈاکٹر، پتلیاں، ص ۱۲۰

31۔ ایضاً، ص۱۳

32۔ ایضاً، ص۵۷

33۔ ایضاً، ص۱۶۱

34۔ ایضاً، ص۱۴۴

35۔ ایضاً، ص۱۳۲

36۔ ایضاً، ص۱۹۹

37۔ ایضاً، ص۲۴۳

38۔ ایضاً، ص۸۸

39۔ ایضاً، ص۳۶

40۔ ایضاً، ص۴۳

41۔ ایضاً، ص۳۷

42۔ ایضاً، ص۱۰

43۔ ایضاً، ص۱۴۹

باب سوم

ناول "پتلیاں" کے کردار: وجودی فکر کے نفسیاتی تناظر میں تنقیدی جائزہ

اردو ناول کی تاریخ میں جہاں بہت سارے نامور ناول نگار موجود ہیں وہاں ایک نام انیس ناگی ہے جدید دور کا فرد جس سیاسی و سماجی بحران کا شکار ہے اِس کی واضح جھلک انیس کے ناولوں میں دکھائی دیتی ہے۔ فرد کے داخلی کرب اور وجودی بحران کو موضوع بنا کر انیس نے معیاری ناول لکھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو ناول نگاری اُن کو ایک منفرد مقام دیتی ہے کہ انھوں نے روایتی ناول کو رد کر کے عشق و محبت کے فرسودہ موضوعات کی بجائے معاشرے کے ٹھوس حقائق اور مسائل پر نظر رکھی۔ جس سے آج کے دور کا فرد دوچار ہے۔ انیس کی ناول نگاری اُن کو اس حوالے سے بھی معتبر مقام دیتی ہے ایک طرف تو انہوں نے روایت سے بغاوت کی اور دوسری طرف ناول کو نئے اسلوب اور موضوعات سے روشناس کروایا۔ ان کا ہر ناول نیا موضوع، نئی فکر اور نئی جہت کی ترجمانی کرتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو انیس کا ادب کے بارے میں یہ رویہ مغربی ادب سے مستعار ہے۔ اِن کے ذہن کی ساخت سے لیکر خیالات اور نظریات کامیو اور سارتر کی دین ہیں۔ اِن کی ناول نگاری کی تفہیم کیلئے اِن ادیبوں کی فکر اور نظریات کا بالخصوص وجودی فلسفے کا مطالعہ بھی از حد ضروری ہے۔ وجودیت کیا ہے؟ وجودی فلسفے کی ماہیت کیا ہے یا ادب اور وجود کا آپس میں کیا تعلق ہے؟

یہ سب باتیں انیس کے ناول وجودی فکر اور صورت حال کی نشاندہی کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں جو کردار تخلیق کیے وہ وجودی کرب کا شکار ہیں۔ وجودیت اور ادب کا گہرا رشتہ ہے۔ وجودیت انسان کے مکمل وجود کا تجربہ ہے۔ ادب کی بنیاد وجودی تجربے پر ہوتی ہے اور زندگی بھی اِس کا موضوع ہے۔ وجودیت فرد کی ذلت اور اِس کے تجربے کے توسط سے سماج، کائنات اور زندگی و موت کی حقیقت کو سمجھنے کی ایک کاوش ہے۔ دو بڑی عالمی جنگوں کے بعد انسانی اقدار کے زوال، مذہبی سطح پر منافرت، اخلاقی حدود سے تجاوز نے انسان کی ذات کے انتشار اور کرب کو مزید گہرا کیا۔

ا۔ ناول "پتلیاں" کے مرکزی کردار

ناول کی کہانی مختلف کرداروں کے ذریعے بیان کی گئی ہے اور افراد کے وجودی تصورات پر روشنی ڈالتی ہے ناول نگار کے تمام کردار اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں اور ناول نگار نے ہر کردار کو جس وجودی تصور کے ساتھ ناول میں پیش کیا ہے وہ اپنے کردار اور تصور کے حوالے سے موقع محل کے مطابق مناسب نظر آتا ہے۔ لیکن

ناول کے مرکزی کردار بڑی اہمیت کے حامل ہیں جن کے گرد ناول کی کہانی گھومتی ہے۔ جن وجودی تصورات کو اِن کرداروں کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے وہ تصورات اِن کرداروں کے حوالے سے معاشرتی صورت حال کو بیان کرنے میں اثر پذیر اور مناسب دکھائی دیتے ہیں۔ مرکزی کرداروں میں ایک کردار جمیل کا ہے جو اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے۔ آیئے اِس کردار کو اِس کے وجودی تصورات کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔

جمیل

مرکزی کردار جمیل ایک خاندان کا سربراہ ہے جس میں اِس کی بیوی پروین، بیٹا امجد اور بیٹی رابعہ ہیں۔ یہ ناول اسی خاندان کی ٹوٹ پھوٹ کا تذکرہ ہے۔ جمیل اعلٰی تعلیم یافتہ ہے مگر وہ معاشرتی رویوں اور تقاضوں کے ساتھ مطابقت نہیں کرپاتا جس کے نتیجے میں اِس کی زندگی انتشار کا شکار ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ یہ کردار مختلف طرح کے وجودی تصورات کا شکار دکھایا گیا ہے جن کا ملال اسے قدم قدم پر ہے۔ اپنی گزرتی عمر اور اولاد کے رویوں کا احساس کچھ اس طرح ہے:

> "بعض دفعہ بازار میں جب کوئی اسے میاں جی کہہ کر پکارتا ہے تو وہ ایک دم جھرجھری لے کر سوچتا ہے کہ میں واقعی بوڑھا ہو گیا ہوں۔ ابھی کل ہی کی بات تھی کہ وہ اِس شہر کی سڑکوں پر اچھلتا کودتا پھرتا تھا۔ اِس کی جوانی کا کسی نے نوٹس نہیں لیا لیکن اِس کے جاننے والے اِسکے بڑھاپے کا نوٹس لے رہے ہیں کہ وہ کچھ کئے بغیر ہی بوڑھا ہو گیا ہے۔ اِس کے بڑھاپے کا احساس اِس کی جوان اولاد ہے جو اِس کے رنگین کپڑوں پر اعتراض کرتی ہے، اسے بات بات پر ٹوکتی ہے اور بعض دفعہ تو یہ بھی کہہ دیتی ہے کہ زوال عمر کے ساتھ اِس کا ذہنی توازن بھی اپنی جگہ سے ہل گیا ہے"[1]

مرکزی کردار "جمیل" ناول "پتلیاں" کا نہایت اہم کردار ہے دوسرے کئی کرداروں کا تعارف اِس کے ذریعے ناول کا حصہ بنا ہے۔ یہ کردار طرح طرح کے کرب میں مبتلا ہے اِس کے ذریعے ناول نگار نے معاشرتی زندگی کی بہت ساری حقیقتوں سے پردہ اٹھایا ہے۔ یہ کردار سب سے زیادہ جس کرب میں مبتلا ہے وہ اِس کی خانگی زندگی ہے۔ گھر کے ماحول میں بطور سربراہ اپنی اہمیت کی کمی کے احساس کو یوں بیان کرتا ہے۔ جمیل کے گھر کے معمولات بھی عجیب سے تھے۔ پروین تیار ہو کر کالج چلی جاتی اور جمیل اسے چھوڑنے جاتا، دس گیارہ بجے امجد اٹھتا اور خود ہی ناشتہ کر کے جمیل کو

ملے بغیر ہی نکل جاتا، رابعہ بھی دیر تک اٹھتی ٹھنڈا ناشتہ کھاتی اور اپنے کمرے میں چلی جاتی اور ٹیلیفون پر اپنی سہیلیوں سے گپ بازی کرنے لگتی، اگر پیسوں کی ضرورت ہوتی وہ جمیل کے کمرے میں آکر پوچھتی "پاپا، آپ کا پرس کہاں ہے؟" جمیل ہاتھ کے اشارے سے اسے بتا دیتا وہ حسب ضرورت پیسے نکال کر چلی جاتی۔ جمیل برا نہ مناتا لیکن وہ یہ سوچتا ہی رہ جاتا کہ یہ لا تعلقی کیوں ہے، گھر کا کوئی فرد اسے سربراہ ماننے کیلئے تیار نہیں ہر ایک اپنی مرضی سے چلتا ہے اور دوسرے کی موجودگی کو ایک مداخلت سمجھتا ہے، یہ جنریشن گیپ نہیں ہے، نوکری سے استعفیٰ دینے کے بعد اِس نے محسوس کیا تھا کہ پروین کا رویہ بدل گیا تھا، وقت کے ساتھ اِس پر ظاہر ہوا کہ پروین غایت درجہ آگریسو عورت تھی اور ہر معاملے میں خود فیصلہ کرنا چاہتی تھی۔ وہ جمیل کے سامنے تو بظاہر کم سے کم گفتگو کرتی لیکن اِس کی غیر حاضری میں سب کچھ اِس کی مٹھی میں ہوتا، اِسے عمر کے اِس حصے میں آکر احساس ہوا تھا کہ پروین اور اِس کا اکھٹے رہنا ایک مس میچ تھا۔ اِس کے باوجود اِس نے زندگی کو ایک سمجھوتے کے تحت چلنے دیا۔

ناول "پتلیاں" ایک خاندان کی ٹوٹ پھوٹ کی داستان ہے جس کا سربراہ جمیل ہے اور خاندان کے اِس ماحول کا اثر اس کی شخصیت پر بھرپور ہے۔ اس کی طبیعت طرح طرح کے احساس اور تصورات کا شکار ہے۔ اِس خاندانی کرب کے ساتھ ساتھ معاشرے کے دوسرے عوامل بھی اُس کی شخصیت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ انیس ناگی اِس کردار کے بارے میں ایک جگہ پر اِس کی نفسیاتی صورت حال کا ذکر کرتے ہیں۔ طلوع آفتاب سے پہلے ہی جمیل کی نیند کھل جاتی۔ وہ سوچنا چاہتا لیکن نیند اس کا ساتھ نہ دیتی۔ چند ایک سالوں سے اسے سوتے ہوئے بھی احساس ہوتا کہ وہ بھاگ رہا ہے۔ جس رات وہ کوئی کرانکلائزر کھا لیتا تو اسے بھرپور نیند آتی۔ وہ ہر روز گولی کی مدد سے سونا نہیں چاہتا تھا۔ یہ اِسکے نزدیک ایک طرح کی شکست تھی اسے اپنے مسائل کا پوری طرح احساس تھا لیکن اسے ہمت کے ذریعے حل تلاش کرنے کی ضرورت تھی۔ اِس میں فیصلے کی ہمت تھی کہ اِس نے ملازمت چھوڑ دی تھی لیکن ملازمت چھوڑنے کے بعد اِس میں ایک حد تک تذبذب اور عدم یقین پیدا ہو گیا تھا۔ جوانی کے زمانے میں وہ بہت سوچا کرتا تھا لیکن اب سوچنے سے پہلے اِس کے ذہن پر ایک دُھند سی چھا جاتی۔ وہ اکثر سوچتا کہ اسے کچھ سوچنا چاہیے، جب وہ سوچ سوچ کر کچھ نہ سوچتا تو اِس کا ذہن ٹوکیو شہر کی طرف سفر کرتا جہاں اِس نے زندگی کا ایک ماہ بسر کیا تھا۔ ٹوکیو کی فضا کسی روک ٹوک کے بغیر تھی۔ لیکن

اب یہ یادیں بھی دُھندلانے لگی تھیں کبھی کبھی ٹوکیو کے فلوشور اور ساحل سمندر میں برہنہ بدنوں کی نمائش اِس کی بے بسی میں شدت پیدا کرتی تھی۔

جمیل کی طبیعت اسے کہیں چین نہیں لینے دیتی۔وہ خود کو ایسے معاشرہ میں گھِرا ہوا محسوس کرتا ہے جہاں پر ہر کوئی ایک دوسرے کے استحصال کے ذریعے زندہ رہنے کیلئے کوشاں ہے وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود خود کو ایک ناکارہ شخص تصور کرتا ہے۔اور سوچتا ہے:

"اِس میں میرا کیا قصور ہے کہ میں وہ نہیں بن سکا جس کی توقع میرے اردگرد کے لوگوں کو ہے۔میری زندگی صرف میرے لیے ہے ۔باقی سب لوگ میرے زندہ رہنے کے وسیلے ہیں۔میں سٹیج ایکٹر نہیں ہوں کہ میں دوسروں کو خوش کروں، میں دوسروں سے الگ ہو کر اپنے آپ کو بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔اب تو زندگی کا تیسرا پہر ہے۔ " (۲)

جمیل اپنے آدرش کے ٹوٹ پھوٹ اور زوال کے بعد اِس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ میں جس سماج میں رہتا ہوں وہ کرپٹ اور منافقت سے بھرا ہوا ہے اور مجھ جیسے لوگ جو سوچ اور شعور کے حامل ہیں، اِس سے ہم آہنگی کی کوئی صورت نہ نکال پائیں گے۔وہ اِس صورتِ حال سے سمجھوتے کی کوشش بھی کرتا ہے، مگر شکست کیلئے اِس کے اپنے بازو کھڑے اِس کا استقبال کرتے ہیں۔یوں اِس کے نظریات، آئیڈیلزم، سماجی رویوں اور معاشرتی دیواروں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے ہیں۔

انیس ناگی نے اپنے ناول "پتلیاں" میں جمیل کو مرکزی کردار کے حوالے سے جس وجودی تصور کے ساتھ پیش کیا ہے وہ معاشرے کی حقیقت معلوم ہوتا ہے جمیل کی خاندانی زندگی، حالات اور خاندان کے افراد کے متضاد رویے اور نفسیاتی کشمکش یہ سب ہمارے معاشرے کے تقریباً ہر دوسرے یا تیسرے گھر کی زندگی ہے۔اور جمیل بطور سربراہ خاندان میں کرب اور انتشاری حالت سے گزرنے پر مجبور ہے۔اسی طرح معاشرے میں رہتے ہوئے سربراہ خاندان کو اِن کا سامنا ہے۔جن سے فرد فرار بھی چاہتا ہے لیکن اِن کے ساتھ جڑا رہنا بھی حالات و واقعات کے مطابق معاشرے کے سارے گھرانوں کی حقیقی تصویر کشی اِس ناول کا موضوع ہے۔ جمیل اپنی فیملی اور گھر کے بارے میں جس انتشاری حالت سے گزر رہا ہے۔ناول نگار اسے کچھ اس طرح بیان کرتا ہے:

"تو میں گھر نہیں جانا چاہتا، وہاں رکھا ہی کیا ہے۔ وہی آلو شوربا، بجلی کا بل، اور مہینے کا راشن، رات کو کچھ سوچے سمجھے بغیر چند ایک کروٹیں لے کر سو جانا ایسی بے کیف زندگی کیلئے اتنا تردد کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ سارا جنجال گھریلو عورتوں نے بچھایا ہوتا ہے۔ رابعہ کا رشتہ ڈھونڈو، امجد کیلئے ڈاکٹرنی کا رشتہ درکار ہے۔ میں نے شادی اِن جھمیلوں کیلئے نہیں کی تھی وہ غلطی ہو گئی۔ لیکن اب سب کچھ بیت چکا ہے، مجھے سب کچھ اپنے اندر رکھنا چاہیے۔ کسی کو بتانے سے کیا فائدہ، نہ جانے لوگ شادی کیوں کرتے ہیں؟ اولاد ہو نہ ہو موت کے بعد اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟[۳]

جمیل کا کردار ناول میں ایک ایسا کردار ہے جس کے ذریعے سے ناول نگار نے گھریلو اور انسان کی نفسیاتی کیفیت کو پر اثر انداز میں بیان کر دیا ہے۔ ناول نگار خانگی زندگی کے حوالے سے فرد کی نفسیاتی کشمکش کو مختلف زاویوں سے پرکھتا ہے اور معاشرے کے اِس پہلو کو آسان اور عام فہم الفاظ میں پڑھنے والے کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ معاشرے میں فرد کی انفرادی حیثیت کے حوالے سے ناول نگار کا انداز دیکھئے:

"میرا خیال ہے پروین آدمی اپنے لئے بہت کم زندہ رہتا ہے دوسروں کا دباؤ اسے ہر طرف دھکیلتا رہتا ہے۔ تنہا آدمی تو ایک وقت کی روٹی کھا کر بھی زندہ رہ سکتا ہے۔ یہ رشتہ دار، عزت کا مسئلہ فلاں کیا کہے گا، فلاں ہمارے بارے میں کیا سوچے گا، مجھے یہ سب باتیں احمقانہ لگتی ہیں، کیا ہم یہ زنجیریں توڑ نہیں سکتے۔"[۴]

ناول نگار اپنی سوچ اور فکر سے معاشرے کے اندرونی و بیرونی تصورات کو کرداروں کے حوالے سے مناسب اور منفرد انداز کے ساتھ قاری کے سامنے رکھتے ہیں۔ مکمل نہ سہی لیکن کسی حد تک حقیقت نگاری اِس ناول سے عیاں ہے۔ معاشرے کی اخلاقی ابتری کی جیتی جاگتی تصویر اِس ناول کا حصہ ہے ناول نگار نے معاشرے کی اِس حالت کو مختلف طرح سے داخلِ تحریر کیا ہے، اور اِس اخلاقی کمی کی وجہ سے معاشرہ کس طرح کے مسائل سے دوچار ہے اس کی مثالیں بھی زندگی کے مختلف شعبوں سے پیش کی گئی ہیں۔ اِس عہد کے افراد کس طرح حالات کے ہاتھوں جیتی جاگتی پتلیاں ہیں کئی مثالوں سے واضح کیا گیا ہے۔ اِس ناول کے بارے میں غلام حسین ساجد لکھتے ہیں:

"اِن کے ناول ہم عصریت کی "بوباس" ہی سے محلو نہیں، اپنے عہد کی سانس لیتی اور ہر لحہ بدلتی ہوئی زندگی کے پوری طرح امین ہیں۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ انیس ناگی "روح عصر" کی تلاش میں نکلنے اور اس کی تصویر کھینچ کر دینے کے دعوے دار بھی نہیں، ناول کا آغاز ہوتے ہی وہ کسی عام سی گلی، راہ داری یا راستے سے شہر کے قلب میں داخل ہوتے ہیں، اور واقعات خود بخود اِن کے وجود پر وارد ہونے شروع ہو جاتے ہیں ان کے کردار دھوپ ہوا اور سائے کی طرح موجود سے نمود کرتے ہیں۔"(۵)

ناول نگار کے منتخب کردہ کردار اپنی اپنی جگہ مناسب نظر آتے ہیں، اور ہر کردار کو کسی معاشرتی المیہ یا تضاد پہلو کے حوالے سے ناول کا حصہ بنایا ناول نگار نے نظام حکومت کی خرابیوں اور رکاوٹوں کو مرکزی کردار "جمیل" کے ذریعے بے نقاب کیا ہے۔ جو ایک کالم نگار ہے۔ نظام سیاست کے حوالے سے ناول نگار نے مرکزی کردار کے خیالات کو کچھ اس طرح قلمبند کیا ہے:

"آج صبح جمیل نے کئی مرتبہ کالم لکھنے کی کوشش کی لیکن چند جملے لکھنے کے بعد قلم رک جاتا۔ کالم کا موضوع تھا "جمہوریت میں فسطائیت" جمیل جمہوریت کا حامل نہیں تھا۔ اِس کے نزدیک سیاست میں شخصیت کا کرزما ہونا ضروری ہے۔ جہاں جہالت ہو وہاں جمہوریت کے نام پر عوام کو بیوقوف بنایا جاتا ہے۔" (۶)

مجموعی طور پر ہم جن تضادات کا شکار ہیں اور سماجی سطح پر محرومیوں اور جدیدیت کی تلاش میں رشتوں میں دراڑوں سے سماجی نظام کو جو ٹھیس پہنچی ہے اِس نے انسان کو تنہائی، خوف، کرب، بے چینی اور دہشت کے گہرے کنویں میں دھکیل دیا ہے۔ اگر لحہ موجود کی انسانی صورت حال کو دیکھا جائے تو ہر طرف عدم استحکام اور بے چینی کے دیو قامت سائے لہراتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور جو بھی ادیب اپنے ماحول سے اثر پذیری کے سبب جو فن پارہ تخلیق کرتا ہے اِس میں اُداسی، خوف، کرب اور دہشت کے عناصر نظر آتے ہیں۔ انفرادی اور اجتماعی سطح پر انسان اسی صورتِ حال کا شکار ہے اور یہی وجودی کرب یا صورت حال ہے جس سے جدید عہد کا انسان دوچار ہے۔

جہاں معاشرتی بگاڑ میں بہت سے عوامل کار فرما ہوتے ہیں وہاں ایک میڈیا بھی ہے۔ میڈیا کی خرابیوں اور اِس کی وجہ سے ہونے والی انتشاری اور بے یقینی کی صورت حال اِس ناول کا ایک موضوع مرکزی کردار " جمیل" جو ایک اخباری کالم نویس ہے۔ ناول نگار نے اِس کردار کے ذریعے سے صحافت کے پیشے اور اِس سے وابستہ لوگوں کے بارے میں باتوں کو ناول کا حصہ بنایا ہے۔ اگر معاشرے میں صحافت کے شعبہ سے وابستہ ارکان کے کاموں اور رویوں کو دیکھا جائے تو ناول نگار کی باتیں حقیقت کے قریب نظر آتی ہیں۔

ناول نگار اپنے ناول کے مرکزی کردار " جمیل" کے ذریعے معاشرے کے متضاد رویوں اور پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ وہ نہ صرف وجودی مسائل کو پیش کرتے ہیں بلکہ اِن کے حل کی صورت کی بھی نشاندہی کر دیتے ہیں۔ مسائل کی وجوہات کو بھی واضح کر دیتے ہیں۔ موصوف کا انداز تحریر اپنی اثر پذیری کے ساتھ قاری کو ساتھ ساتھ لیکر چلتا ہے۔ ناول نگار نہ صرف ماضی بلکہ حال کو بھی بیان کرتا ہے۔ موصوف کے بتائے ہوئے تصورات کا ماضی اور حال آپس میں جڑا ہوا نظر آتا ہے۔

وجودیت پسند ادیبوں نے فرد کی آزادی کو ایک قدر کے طور پر پیش کیا اور جبر، انتشار، بے چینی، کرب، تشدد کو اپنی تحریروں کا حصہ بنایا۔ وجودی کردار آزادی کے گرد گھومتے ہیں۔ وہ ہر لمحہ اپنے آپ کو ایک نئے موقف ایک نئی صورتحال کا شکار پاتے ہیں۔ وجودیت نے انسان کو مایوسی دی مگر اِس فلسفے میں صداقت اور گہرائی ضرور ہے جس نے اُردو ادب کے ادیبوں کو بھی بالواسطہ طور پر اپنے اثرات کی لپیٹ میں لیا۔ انیس ناگی کا وجودیت کے بارے میں اپنا کیا خیال ہے وہ اِس بارے میں لکھتے ہیں:

> "وجودیت ہی ایک ایسا نظریہ ہے جس نے بیسویں صدی میں ادب کو سب سے زیادہ متاثر کیا، اور اِسی حوالے سے ادب میں انسان اور اِس کی انتہا کو سمجھنے اور اِسے اپنے آپ سے مربوط کرنے کا ایک نیا پرسیشن پیدا ہوا۔"(۷)

اگر لمحہ موجود کی انسانی صورت حال کو دیکھا جائے تو ہر طرف عدم استحکام اور بے چینی کے سائے لہراتے ہوئے نظر آتے ہیں اور جو بھی ادیب اپنے ماحول سے اثر پذیری کے سبب جو فن پارہ تخلیق کرتا ہے ۔اس میں یہ عناصر دیکھے جاسکتے ہیں۔ آج کے معاشرے کا فرد کس طرح دوہری سطح پر موجودی کرب کا شکار ہے۔ مرکزی کردار کی داخلی کیفیات کو ناول نگار نے اپنی تحریر کا حصہ بنا کر یہ بات واضح کر دی ہے کہ فرد لمحہ بہ لمحہ کس طرح داخلی احساس کے تابع رہ کر دنیا کو دیکھتا ہے۔ وہ معاشرتی پابندیوں اور رکاوٹوں کے احساس سے اپنے خیالات کو دبا تو سکتا ہے لیکن اُن احساسات کی رو میں بہہ جانے سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکتا۔ فرد کے

جبلی احساسات کو ناول نگار نے ناول کے کردار "جمیل" کے ذریعے سے مناسب انداز میں پیش کیا ہے۔ جمیل اور راحت کی کئی ایک خفیہ ملاقاتیں ہو چکی تھیں دونوں بر ملا ملنے سے ڈرتے تھے کہ دونوں کو دیکھے جانے کا ڈر تھا، راحت کو ابھی تک اپنے خاوند کا خوف تھا اور جمیل کو اپنے بیوی بچوں کا۔ کیونکہ اِس نے اپنے ارد گرد جو ہیولٰی بنایا ہوا تھا وہ اسے توڑنا نہیں چاہتا تھا کہ آدمی کیلئے نئی عورت کیلئے کبھی خواہش ختم نہیں ہوتی، وہ سب کچھ اپنے اندر دبا کر رکھتا ہے اور صرف اپنے معاشرتی منصب کے عکس کو بحال کرنے کیلئے ایک جعلی سی زندگی بسر کرتا ہے۔ دوستوئیفسکی انسانی آزادی کا مبلغ ہے اور انسانوں کے عصری مسائل اور نفسیات سے گہری وابستگی رکھتا ہے۔ اس کے ناولوں کو ایک نئی مصنویت ملی ہے۔ یہی فکر اور سوچ انیس ناگی کے ہاں بھی ملتی ہے۔ انیس ناگی کے ناول "پتلیاں" کا مرکزی کردار معاشرے کے ان تمام افراد کے تصور وجود کا عکاس ہے جو اِس طرح کے ماحول کا حصہ ہیں۔ جمیل اپنے معاشرے کے بارے میں کیا تصور رکھتا ہے۔ اِس حوالے سے اقتباس پیش ہے:

> "وہ سوچتا رہتا وہ کسی اخلاقی قدر کی قید میں نہیں تھا۔ وہ بھی ضرورتوں اور تقاضوں میں بندھا ہوا تھا لیکن اسکے باوجود جو کچھ چاہتا تھا وہ کچھ کر نہیں سکتا تھا اسکے اندر ایک نامعلوم سی اکتاہٹ تھی۔ وہ اپنے لئے ایک اندرونی آزادی چاہتا تھا، جو یہاں ممکن نہیں تھی اخبار سے تعلق نے اسے مرنے سے بچایا تھا لیکن اپنے خاندان کیلئے وہ کچھ نہیں کر سکا تھا۔ اسے یہ حوصلہ تھا کہ پروین اِسکی کمی کو پورا کرتی ہے۔ پروین سب کچھ کرتی تھی لیکن ایک چھپی ہوئی رنجش کیساتھ، یہ سب کچھ کرنا تو مرد کا کام ہے جب جمیل کے اندر کا مرد بیدار ہوتا تو اسے سب کچھ لایعنی لگنے لگتا کیونکہ ہر معاملے میں وہ اپنے کو بے اختیار محسوس کرتا۔" (۸)

جمیل اپنی ہستی اور دنیا کے ساتھ یکتائی سے گریزاں ہے وہ ہستی کی دم بدم متبدل صورت حال سے فرار چاہتا ہے۔ مگر کرب کی یہ حالت وجود اور فرد کو ایک رشتہ میں بندھنے پر مجبور کرتی ہے۔ اور یہ کرب "جمیل" کو ذمہ داری کی آگہی بھی دیتا ہے اور حالات وواقعات کا مقابلہ کرنے پر بھی اکساتا ہے۔

جمیل اِس اقداری نظام سے بچنے کیلئے طرح طرح کی سوچ کا شکار ہوتا۔ اپنے افراد خانہ کے درمیان اپنے ناہونے کا احساس اور انتشاری کیفیت اسے بے چین رکھتی۔ ناول "پتلیاں" وجودی عناصر سے بھرا پڑا ہے ناول نگار نے نا صرف معاشرے کے ظاہری وجودی تصورات کو پیش کیا بلکہ افراد معاشرہ کے داخلی

خیالات کو بھی پرکھا ہے۔ناول کے دوسرے کرداروں کے ساتھ مرکزی کردار جس احساس کرب کے ساتھ ناول میں دکھائی دیتا ہے کرب کا وہ اثر دوسرے کرداروں کے ہاں ہلکا دکھائی دیتا ہے۔کرب کے حوالے سے کرکیگارڈ کے الفاظ دیکھئے:

"کرکیگارڈ کرب کو جان و تن کی خاص ساخت کے ساتھ مربوط کرتا ہے جوروح قائم ہے۔اسکے نزدیک فرد ہر حال میں ایک عصبی تناؤ کا شکار ہے۔اور یہ عصبی تناؤ ہی کرب ہے۔"(۹)

انیس ناگی کے ناول میں زیادہ تر دنیاوی تصور ملتا ہے جو مذہبی تصور سے بالکل مختلف ہے۔اِس ناول میں ناول نگار نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ آدمی کو دنیا میں دھکیل دینے کا عمل کس طرح اسے خود سے بیگانہ کر دیتا ہے۔کس طرح فرد وجود-در-دنیا کے ساتھ نبرد آزما ہوتا ہے،اور ایک کشمکش جنم لیتی ہے۔وجود کو دنیا میں طمانیت نہیں ملتی،کیونکہ دنیا میں وہ خود اپنے آپ سے بچھڑ جاتا ہے۔اور اِس پر کرب اور بیگانگی کی ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔یہ کیفیت "جمیل" پر پورے ناول میں طاری رہتی ہے اور وہ کسی عمل کے حوالے سے گومگو کا شکار رہتا ہے۔وہ اپنے آپ کو کسی دوراہے پر کھڑا محسوس کرتا ہے۔اُس کیلئے دونوں اطراف کے راستے اور نتائج اجنبی ہوتے ہیں۔جمیل امکان کی صورت حال میں رہتے ہوئے فیصلے کرتا ہے لیکن پھر بھی ایک انتشاری کیفیت اور بے چینی کی فضا اُس کے گرد بنی رہتی ہے۔اِس کردار پر کئی تصورات اثر پذیر ہیں جن کی وجہ سے اِس کی کمی اپنی ذات میں کہیں گم ہے۔وہ اپنی ذات کو تلاش کرنے اور اِسے اِس قید سے نکالنے کیلئے کئی پلان کرتا ہے لیکن وہ اس جال سے اِسے آزاد نہیں کرپاتا۔وہ بے بسی کی حالت میں کنارے پر بیٹھا اپنے وجود کی منجدھار میں ڈوبتا دیکھتا ہے۔ناول سے دیکھا جائے تو جمیل کی زندگی ہر طرح کی اُمید سے تہی تھی،وہ پیہم مایوسی میں رہتا،راحت سے ملاقات اسے چند لمحوں کا سکون دیتی لیکن اِس کے بعد اِس کا ذہن ایک دھند میں چھپ جاتا جہاں ٹٹول ٹٹول کر بھی اسے راستہ ملتا۔بے بسی کے لمحات میں کبھی کبھار اسے امجد کا خیال آتا کہ امجد کے ملازمت پر آنے سے معاملات بہتر ہو جائیں گے وہ جس سروس گروپ میں ہے اِس میں رشوت کی مدد سے ایک دو سالوں ہی میں سارے دکھ دور ہو جاتے ہیں۔یہ بھی کیا زندگی ہوگی،لیکن آج کل رشوت کو کون بُرا کہتا ہے،لوگ سرکاری ملازموں کی بڑی بڑی کوٹھیاں اور کاریں دیکھتے ہیں اور احتجاج کرنے کی بجائے مسرت کا اظہار کرتے ہیں۔

ناول نگار نے نہ صرف اِس ناول میں معاشرتی مسائل اور ناہمواریوں کو واضح کیا ہے بلکہ فرد کی نفسیات کے رموز او قاف کو بھی پرکھا ہے۔ عمر، جنس اور وقت کے حساب سے فرد کی نفسیات پر معاشرتی اور خانگی حالات کس طرح اثرانداز ہوتے ہیں اِس ناول میں اِن عناصر پر بھرپور بحث ملتی ہے۔ناول کا مرکزی کردار جمیل ایک ایسا کردار ہے جس کے ذریعے ناول نگار نے معاشرے کے کچھ پہلوؤں اور گھریلو زندگی کے حوالے سے ایک کسک اور بیگانگی کو ظاہر کیا ہے۔

معاشی مسائل سے پیدا ہونے والی ایک غیر یقینی صورت حال جو معاشرے کا ایک اہم مسئلہ ہے ناول نگار نے مرکزی کردار " جمیل " کے ذریعے اِس صورتحال کو اور اِس سے پیدا ہونے والی نفسیاتی الجھنوں کو ناول کا موضوع بنایا ہے۔ جیسا کہ جمیل اِس سوچ میں مگن تھا کہ وہ آج کا دن کیسے بسر کرے گا، وہ سڑکوں پر چل چل کر کتب خانوں میں جا جا کر تنگ آ چکا ہے۔ اِس نے ایک دو اخباروں سے دوبارہ رابطے کئے تھے لیکن کوئی خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ اسے یوں لگتا تھا کہ زندگی نے اِس پر سارے دروازے بند کر دیئے ہیں۔ وہ ابھی نشاط سے کلینک کھولنے کی بات نہیں کر سکا تھا، جگہ مانگنے میں وہ اپنی سبکی محسوس کرتا تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ مہینے میں چار کالم چھپنے سے اِس کی زندگی نہیں چل سکتی تھی۔ پروین کو محکمے سے معقول واجبات مل گئے تھے جس سے زندگی کو ممکن بنایا جا سکتا تھا، لیکن وہ عورتوں کی نفسیات سے پوری طرح آگاہ تھا کہ روپے پیسے کے معاملے میں عورتیں کنجوس ہوتی ہیں اور ہمیشہ یہ توقع رکھتی ہیں کہ اخراجات اٹھانا مرد کا فرض ہے اور اِن کا کام مرد کی جنسی ضروریات پوار کر کے حق جتانا ہے۔

انیس ناگی کا یہ ناول اپنے اندر مختلف رنگ سجوئے ہوئے ہے اور یہ رنگ معاشرے کے حقیقی رنگ دکھائی دیتے ہیں۔ ناول نگار معاشرے کے صندوقچے سے ایک ایک کر کے یہ رنگ ہمارے سامنے پیش کرتا جاتا ہے اور ساتھ ساتھ اپنے فلسفیانہ انداز سے اِن کی وضاحت پیش کرتا ہے۔ مختلف تصورات کی وضاحت کی پیشکش کے لئے ناول نگار کرداروں کا سہارا لیتا ہے۔ ناول مرکزی کردار " جمیل " کے ذریعے ازدواجی زندگی کی وضاحت کچھ یوں کرتا ہے۔ ان دونوں میں سے کم سے کم جمیل کو اب یقین ہو چکا تھا کہ شادی ایک ناقابل عمل سمجھوتا ہے، سمجھوتا ایک عارضی معاہدہ ہوتا ہے، جو اختلاف کو عارضی طور پر ختم کرنے کیلئے کیا جاتا ہے۔ اِس کی دلیل یہ تھی کہ ایک عورت اور ایک آدمی دو مختلف حالات اور پس منظر میں پرورش پا کر ایک دوسرے کے روبرو ہوتے ہیں، ہر ایک کی سونے کی، کھانے پینے کی اور پرسنل ہائیجین کی عادات دوسرے سے مختلف ہوتی

ہیں، یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک سمجھوتے کی خاطر انسان اپنے تربیتی ڈھانچے کو اٹھا کر پھینک دے؟ وہ اِس نتیجے پر بہت دیر سے پہنچا تھا کہ معاشرے کی بیشتر علالتیں خانگی ناراضگیوں اور رنجشوں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

اِس ناول میں "جمیل" کے حوالے سے حالات زندگی کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے کہ حالات اِس قدر قوی ہوتے ہیں کہ اِن کو پسپا کرنا انسان سے بہت مشکل ہو جاتا ہے اور اکثر و بیشتر حالات سے مقابلہ کرتے کرتے انسان خود زیر ہو جاتا ہے۔ حالات فرد کی زندگی کو راکھ کا ڈھیر بنا دیتے ہیں۔ جس میں فرد خود کی ذات کو کھو دیتا ہے، بے چینی کی یہ صورتحال معاشرے کا ایک حقیقی پہلو ہے۔ ناول کا مرکزی کردار "جمیل" بھی حالات کی اِس دائمی صورتحال سے نبرد آزما ہے وہ اِن حالات کے ہاتھوں دِل گرفتہ تھا اسے جو رنج تھا اس کا کوئی حل دکھائی نہیں دیتا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ زندگی میں ایک جمود کی کیفیت سے دوچار ہے، اسے زندگی ایک دلدل کی مانند دکھائی دیتی ہے جس میں پھنس کر فرد بے بس ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو حالات کے حوالے کر دیتا ہے۔ مرکزی کردار جمیل کے احساسات اسے اپنے گھیرے میں لے لیتے ہیں وہ اِن سے فراغت چاہتا ہے لیکن کوئی بھی صورت اِن سے بچاؤ کی نظر نہیں آتی۔ سوچ و فکر سے معاملات کی تہہ تک پہنچنے کے بعد بھی مایوسی کا سامنا کرتا ہے۔ چونکہ جمیل ایک پڑھا لکھا کردار ہے زندگی کی حقیقتوں کو سمجھتا ہے اور اِن سے راہ فرار کی ناممکن کوشش میں رہتا ہے۔ ناول نگار نے اِس کردار کے حوالے سے احساس بیگانگی کو واضح کیا ہے کہ کس طرح ایک فرد خانہ ہر ممکن کوشش سے اپنے ساتھ جڑے رشتوں کو سنبھالتا ہے اور وہی افراد جب زندگی میں آگے بڑھتے ہیں تو اپنے اُس بندھن کو فراموش کر کے خود غرضی و خود پسندی کی زندگی بسر کرنے لگ جاتے ہیں۔ ناول نگار نے زندگی کے مختلف مراحل میں ہونے والے احساسات و تصورات کو "جمیل" جو ایک مرکزی کردار ہے کے حوالے سے س کافی حد تک بیان کیا ہے۔ "جمیل" کی سوچ و فکر معاشرے کے ایک بہت بڑے حصے کی سوچ و فکر ہے، جو افراد کو لاحق ہوتی ہے اور کچھ ایسی ہی فکر کے ساتھ زندگی کے کٹھن سفر کو سرانجام دیتے ہیں۔ ایک اقتباس دیکھئے:

> "اِس پر یہ احساس غالب آنے لگا کہ اِس کی زندگی میں کوئی حیثیت نہیں ہے، وہ کچھ بھی حاصل نہیں کر سکا، اور تو اور اپنی رہائش کیلئے ایک چھت بھی تعمیر نہیں کر سکا، میں عمر بھر کیا کرتا رہا ہوں؟ صرف کالم لکھنا ہی تو زندگی نہیں تھی میں ایک عورت پر انحصار کرتا رہا ہوں کہ وہ سب کچھ کرے گی، لیکن اب بہت دیر ہو چکی ہے، حواس سہہ سہہ کر تھک گئے ہیں، میں زندگی کی

لذتوں اور آسائشوں تک نہ پہنچ سکا، میں بدن کی لذتوں سے محروم رہا، یہ بھی
کوئی زندگی تھی۔"(۱۰)

یہ ناول زندگی کی مختلف پرتوں کو کھول کھول کر قاری کے سامنے رکھتا ہے اور ہر پہلو پر حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔ اگر معاشرے پر نظر دوڑائی جائے تو ناول "پتلیاں" میں بیان کیے گئے تصورات ہمیں افراد کی کثیر تعداد کیساتھ جڑے ہوئے نظر آئیں گے، مایوسی، کرب، اور احساس بیگانگی کا تصور جو ناول کے کردار "جمیل" کے ساتھ وابستہ ہے۔ وہ اِس کردار کے خانگی و معاشرتی مقام کے عین مطابق دکھائی دیتا ہے، یہ کردار خانگی، معاشرتی اور ذاتی کرب میں مبتلا ہو کر بہت سارے تفکرات کا شکار دکھایا گیا ہے، ناول نگار کی یہ سوچ معاشرے کی حقیقی عکاس ہے، جو افراد معاشرہ کو ایک جال میں قید رکھتی ہے، کبھی وہ جال میں تنہا ہی پابند سلاسل ہوتا ہے کبھی معاشرے کے دوسرے افراد کے ساتھ۔ تنہائی و بیگانگی کا احساس اُسے محفل میں بھی گھیرے رکھتا ہے اور خلوت میں بھی، ناول نگار نے اپنی اِس زندگی کی بے چینی اور تلخیوں کا ذکر فلسفیانہ انداز میں کیا ہے۔ انیس ناگی ناول میں جمیل کے بارے میں کہتا ہے کہ بہت دِنوں سے وہ اِس احساس سے مغلوب تھا کہ اِس کا دِل بھر گیا تھا وہ زندہ رہنے کے جس کھیل میں مصروف تھا وہ بے ثمر تھا، وہ اب اپنی زندگی بدلنا نہیں چاہتا تھا، ایک دو برسوں سے وہ جن ہنگاموں میں سے گزرا تھا انھوں نے اسے اندر سے کافی شکستہ کر دیا تھا، اعصابی شکستگی کے ساتھ اسے اپنی عمر کا بوجھ بھی محسوس ہونے لگا تھا کہ چند برس اور زندہ رہنے کیلئے اتنی تگ ودو کی کیا ضرورت ہے، ابھی تک وہ کچھ کرنا نہیں چاہتا تھا وہ کرنے پر مجبور تھا، وہ اپنا آپ جینا چاہتا تھا کہ ایک آزاد روح کی طرح اِس دنیا کو خیر باد کہے جو اِسکے برزخ سے کم نہیں تھی۔

جمیل کی زندگی ہر طرف سے مایوسیوں کا شکار ہو کر ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح بنی ہوئی ہے وہ جن حادثات سے گزر رہا ہے گھر میں کسی کو اُس کا احساس نہیں ہے، کبھی ماضی کی تلخیوں میں پھنس کر کبھی حال کی محرومیوں کا شکار ہو کر جمیل اپنی ذات میں اجنبی بن کر رہ گیا ہے۔ وہ زندگی کو دیکھتا اور سوچتا ہے کہ میں تو ایک تھکا ہارا مسافر ہوں جسکی گھر واپسی کے سوا اور کچھ ساتھ نہیں لائی ہے۔ اب یہ وقت بحث قبول کرنے یا انکار کرنے کا نہیں ہے سب کچھ بیت چکا ہے میں اپنی ذات کیذمہ داری بھی قبول نہیں کر سکا اور زندگی کو ایک پتلی کیطرح بسر کیا جس کا اختیار کسی اور کے ہاتھ میں تھا زندگی رائیگاں گئی اور میرے پاس زندہ رہنے کا کوئی جواز نہیں ہے، اگر زندہ رہنے کا جواز نہیں ہے تو پھر واقعی زندہ رہنا ضروری ہے؟ اگر انسان جذباتی موت کے بعد بھی زندہ رہنے کی خواہش رکھتا ہے تو یہ تضاد میں رہنا ہے یا بزدلی کی زندگی بسر کرنا ہے۔

ناول میں جمیل کا کردار اپنی جگہ ایک مناسب کردار ہے جو معاشرے میں اپنے جیسے افراد کی سوچ و فکر کا عکاس ہے، لیکن ناول نگار نے اِس کردار کے حوالے سے معاشرے کے جن پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔ اُس کے علاوہ بھی کچھ پہلو ہیں جن کا ذکر کرنا چاہیے تھا کیونکہ جس معاشرے میں ہم رہ رہے ہیں اِس کے افراد پر صرف مغربی و غیر اسلامی وجودی اثرات ہی ہیں۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو جمیل کا کردار اور اِس کے حوالے سے بیان کیے گئے تصورات حقیقت کے قریب نظر آتے ہیں۔

پروین

ناول کا مرکزی کردار "پروین" بھی اپنی نوعیت کا ایک مناسب کردار ہے، جو پیشے کے اعتبار سے ایک لیکچرر ہے، چاہے اِس کے تصورات وجود "جمیل" سے الگ ہیں لیکن اپنی جگہ پر نسوانی نفسیات کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ یہ کردار بھی دوہری وجودیت کا شکار ہے ایک طرف تو اِس کی ازدواجی زندگی ہے جس سے وہ مطمئن دکھائی نہیں دیتی دوسری طرف ایک اچھی زندگی کا تصور بھی اس کردار کے ہاں ملتا ہے ناول نگار نسوانی نفسیات کے حوالے سے لکھتا ہے:

> "لڑکیاں ایک اچھی زندگی کیلئے پاگل ہوتی ہیں، خوبصورت عورتیں بھینسا نما مردوں سے شادی کرتی ہیں، ایسے مرد جن کو ایک لمحے برداشت کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ سہولت، آسائش، سب جمالی معیاروں کو پل میں مسمار کر دیتی ہیں۔"(۱۱)

ناول نگار نے اِس ناول میں عورتوں کی نفسیاتی کشمکش اور شخصی تکمیل کے حوالے سے وضاحتیں پیش کی ہیں۔ جوان نظر آنے کی خواہش اور شخصی کردار کو "پروین" کے حوالے سے ناول کا حصہ بنایا ہے۔ ناول نگار اِس کردار کی نفسیات چاہے وہ عمر کے حوالے سے ہوں یا حالات و واقعات کے حوالے سے اِس طرح پیش کیا ہے کہ وہ نفسیات معاشرے کے نسوانی کرداروں کی اکثریت پر موزوں دکھائی دیتے ہیں۔ معاشرے میں نسوانی تذبذب کو مختلف زاویوں سے دکھانے کیلئے جہاں دیگر نسوانی کرداروں کے ذریعے سے بیان کیا ہے وہاں مرکزی کردار "پروین" کے حوالے سے بھی نسوانی تصورات اور اِن کے اثرات کو پرکھا ہے۔ ناول نگار نسوانی نفسیات کو واضح اور عام فہم الفاظ میں بیان کرتا ہے، کہ ایک عورت معاشرے میں اپنے خاوند کے بعد دوسروں سے کس طرح کے تصورات رکھتی ہے ناول نگار عورت کی باریک بین نگاہوں سے بننے والے داخلی احساسات

کو ایسے پیش کرتا ہے کہ وہ حقیقی دکھائی دیتے ہیں، ایک اقتباس دیکھئے جو ناول کے مرکزی نسوانی کردار کے حوالے سے ہے:

> "وہ ایک عام سی لڑکی کی طرح ایک اُدھیڑ بن میں رہتی کہ عمران صرف جسمانی تعلق کیلئے اِس سے دوستی چاہتا ہے یا وہ اِس تعلق کو کسی دائمی رشتے میں تبدیل کرنا چاہتا تھا۔اِسے اپنی حیثیت کا بھی احساس تھا کہ اِس کا باپ ایک اوسط درجے کا تاجر ہے جو زندگی میں سہولت تو پیدا کر سکتا ہے لیکن اسے قبول نہیں کر سکتا،اسلئے اِس کا عمران کے ساتھ جوڑ بے جوڑ ہو گا، وہ اِس سوچ میں فلسفہ کی کتابیں بھولنے لگی تھی۔" (۱۲)

پروین ناول کا ایک ایسا کردار ہے جس کی ذہنی انتشاری کیفیت جمیل سے کسی حد تک مختلف ہے، کیونکہ وہ ایک نسوانی کردار ہے اس لئے نسوانیت کے زیر اثر ہے، ناول نگار نے معاشرے کے نسوانی طبقہ کی نفسیات کو مختلف پہلوؤں سے پرکھا ہے، اور جس پہلو کو بھی نمایاں کیا ہے، وہ نسوانی جذبات واحساسات کے ساتھ کسی حد تک مطابقت رکھتا ہے۔

انیس ناگی نے اپنے ناول میں اِس مرکزی کردار کے ذریعے سے مردوں کے مقابلے میں عورتوں کے جذبات واحساسات کو نمایاں بھی کیا ہے اور کئی جگہ اپنے منفرد الفاظ میں اُن کی وضاحت بھی پیش کی ہے کہ کس طرح عورتوں پر وجودی تصورات اثر پذیر ہوتے ہیں۔ کردار "پروین" کے ذریعے مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والی عورتوں کی نفسیات اور الجھنوں کو بیان کیا ہے اور اُن کی شخصیت کی آڑ میں چھپے ہوئے وجودی عناصر کی وضاحت کی ہے، عورت کی نفسیات کے بارے میں ناول نگار لکھتے ہیں:

> "عورت کم کم بولتی ہے، وہ چند جذبوں کا مجموعہ ہوتی ہے جونہی اِسکے کسی جذبے کی گرفت ڈھیلی ہو جاتی ہے تو اِس کا جذباتی نظام بکھرنے لگتا ہے۔اِس میں اس کے ہارمونز کے بیلنس کا بھی مسئلہ ہے، ایکسٹرا میریئل ویشنز کی خواہش مرد اور عورت میں کہیں نہ کہیں چھپی ہوتی ہے، عورتیں چھپا کر دل کی تہہ میں رکھتی ہیں اور مرد اِس کا اظہار کر دیتا ہے۔" (۱۳)

ناول نگار نے کردار "پروین" کے داخلی تاثرات جو اولاد کے بارے میں ہیں اُن کی وضاحت آج کے معاشرے میں اولاد کے ماں باپ کے بارے میں رویوں کے حوالے سے کی ہے، کہ کس طرح والدین اپنے

وسائل کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنی ضرورتوں پر اولاد کی ضرورتوں کو ترجیح دیتے ہوئے ہر ممکن طرح سے اُن کی خواہشات اور ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور اولاد ماں باپ کے محدود وسائل اور اپنی لامحدود خواہشات کا رونا روتے ہیں۔ پروین اپنے بیٹے امجد کے مناسب رویے سے جو اُس کا جمیل اور پروین کے بارے تھا سے نالاں ہو کر سوچتی ہے کہ:

"ہر عورت جبلی طور پر اولاد کی تمنا کرتی ہے اِس کی پیدائش کا عذاب بھی سہتی ہے لیکن کیوں؟ کیا ایک وجود کو اِس لئے جنم دیا جائے کہ وہ اپنے جنم کی سزا دے۔"(۱۴)

پروین ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ عورت ہے جو شعبہ تعلیم کے ساتھ وابستہ ہے، معاشرے کا تعلم یافتہ طبقہ توہم پرستی سے کسی حد تک دور ہو کر حقیقت پسندی کی زندگی بسر کرتا ہے، لیکن ایک عورت کے ساتھ اُس کی نسوانیت بھی جُڑی ہوتی ہے، اُس کا زویہ فکر مرد سے مختلف ہوتا ہے، جب وہ حقیقت میں رہتے ہوئے اپنی ضرورتوں اور خانگی زندگی کی تکمیل نہیں کر پاتی پھر یا تو مایوسی کا شکار ہو کر اپنی خواہشات کا گلہ گھونٹ دیتی ہے یا پھر توہم پرستی کا شکار ہو جاتی ہے، ناول کا مرکزی کردار پروین تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بیوی اور ایک ماں بھی ہے اور یہ کردار معاشرے میں ایک ایسی ماں کا تصور پیش کرتا ہے، جو معاشرے میں اکثر ماؤں کے تصورِ وجود سے میل کھاتا ہے، پروین جب اپنی گھریلو زندگی اور اولاد کے بارے میں ہر طرف سے مایوسی کا شکار ہو جاتی ہے تو اِن سب کی تکمیل کیلئے پیروں کا سہارا لیتی ہے، جو ہمارے معاشرے کی ایک جیتی جاگتی حقیقت ہے، اور ایک شاہ صاحب کے پاس جا کر کہتی ہے:

"شاہ صاحب مجھے اپنے بیٹے کیلئے نوکری چاہیئے، ایک بیٹی ہے اِس کیلئے مناسب رشتہ نہیں مل رہا، ادھر میرے پاس مکان کوئی نہیں ہے ایسی دعا کریں کہ خُدا میرے لئے بھی راستہ کھول دے، میں بہت پریشان ہوں رات کو سو نہیں سکتی۔"(۱۵)

ناول نگار نے ناول "پتلیاں" میں کردار "پروین" کو روایتی تصورِ وجود کے ساتھ اِس طرح پیش کیا ہے کہ یہ معاشرے کی مجموعی ماؤں کا تصورِ وجود معلوم ہوتا ہے۔ پروین کا یہ وجود ایک ماں کی مامتا کو اور بے لوث محبت کو ظاہر کرتا ہے جو اُس کی اپنی اولاد کے حوالے سے ہوتی ہے۔ پروین بھی اپنے اِس تصورِ وجود کے زیرِ اثر ہے، اور معاشرے میں زندگی گزارنے کیلئے گھر اور زندگی کی ضرورتوں کی تکمیل کیلئے، دولت اور اولاد

کی خواہشات کی تکمیل اور اُن کی بہتر زندگی کی خواہش مند ہے۔ پروین کا یہ تصور وجود معاشرے کی ہر ماں کا تصور وجود ہے، جس کے تحت وہ ساری زندگی گزارتی ہے۔ناول نگار نے ناول کے اِس نسوانی کردار کو اِس معاشرے کے ایک روایتی کردار کی شکل میں ناول کا حصہ بنایا ہے، کہ کس طرح ہمارے معاشرے کی عورت ایک گھریلو عورت کے طور پر معاشرے کا حصہ ہے جس میں طرح طرح کے گھریلو تصورات موجود ہیں، اور کس طرح وہ اپنے خاوند کے ساتھ مل کر گھریلو زندگی کو ترتیب دیتی ہے، اور اگر خاوند کی توجہ بھرپور نہیں پاتی تو کس طرح وہم و گمان کا شکار رہتی ہے۔ناول میں پروین کو معلوم تھا کہ جمیل چوری چھپے شراب پیتا ہے لیکن اِس نے جمیل کو اِس کا احساس نہیں ہونے دیا تھا، اسے یہ بھی معلوم تھا کہ جمیل کا کسی صحافی عورت سے رابطہ تھا جسے جمیل نے درخور اعتنا نہیں سمجھا تھا پروین کو یقین ہو چکا تھا کہ جمیل ایک دھوکے باز قسم کا شخص تھا جس کا علم اور ظاہری متانت ایک پوز تھا، دِن بدن وہ ان کے خاندان کیلئے غیر ضروری ہوتا جارہا تھا، پروین کنکھیوں سے اِس کا جائزہ لیتی رہتی۔اسے خدشہ تھا کہ جمیل اِن حالات میں کوئی غیر معمولی قدم نہ اٹھالے کیونکہ وہ ایک مسلسل دباؤ میں تھا، اِس نے جمیل میں مزید ایک تبدیلی دیکھی کہ وہ زیادہ وقت گھر میں بسر کرنے لگا تھا۔ کبھی کالم لکھتا اور کبھی نہ لکھتا اخبار کو ٹیلیفون کر دیتا اور وہاں سے چپڑاسی اِسکے گھر سے کالم لے لیتا۔

انیس ناگی نے "پروین" کے کردار کو ایک گھریلو عورت کے حوالے سے زیادہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے اگرچہ وہ پڑھی لکھی ہے اور نوکری کے حوالے سے اُس کا باہر کی دنیا سے بھی کچھ نہ کچھ تعلق ہے لیکن ناول "پتلیاں" میں پروین کو گھرداری اور افراد خانہ سے متعلق جذبات و احساسات کے حوالے سے واضح کیا گیا ہے۔اِس کردار کے ذریعے ناول نگار نے ہمارے معاشرے کی ماں اور بیوی کے تصور وجود کو بیان کیا ہے جو حقیقت سے کافی حد تک میل کھاتا ہے۔

امجد

یہ بھی ناول کا ایک اہم کردار ہے جس کو ناول نگار نے کئی پہلوؤں سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔یہ کردار ایک نوجوان کردار ہے جو ڈاکٹری کی ڈگری ہونے کے باوجود بے روزگار ہے، اور حصول روزگار کیلئے مختلف طرح کے خیالات میں مبتلا ہے، اِس کی شخصیت کے مختلف تصورات کو ناول نگار نے کئی جگہ پر وضاحتی انداز اپنائے ہوئے بیان کیا ہے، یہ کردار ہمارے معاشرے کے پڑھے لکھے بے روزگار نوجوانوں کی ایک کڑوی داستان ہے جس کو ناچاہتے ہوئے بھی وہ سننے پر مجبور ہیں۔اقتباس دیکھئے:

"یار میں اخباروں اشتہار دیکھ دیکھ کر تنگ آگیا ہوں ، لگتا ہے کہ اِس معاشرے کو ڈاکٹروں کی ضرورت نہیں ہے؟ میں ایک دو جگہوں پر گیا ہوں وہ مجھے کمپاؤڈر کی تنخواہ دینے کو تیار تھے۔ یار بہتر نہیں تھا کہ ہم پرچون کی دوکان کھول لیتے یا ڈرگ کے کیریئر بن جاتے۔"(۱۶)

امجد ایک ایسا نوجوان کردار ہے جو تعلیم یافتہ ہے اور طرح طرح کے وجودی تصورات میں گھِرا ہوا ہے، وہ سرکاری ملازمت کے حصول کیلئے سرکرداں ہے وہ ہر ممکن طریقے سے حصول ملازمت کے بعد اپنی معاشی تشنگی کو بجھانا چاہتا ہے، اِس کے لیے جائز و ناجائز کا تصور اُس کے ہاں صرف ایک ہے کہ زیادہ سے زیادہ پیسہ کما کر اپنی زندگی کو بہتر اور پر آسائش بنایا جائے وہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں سوچتا ہے، منصوبہ سازی کرتا ہے، اُس کی بے قراری اور بے چینی اِس معاشرے کے ہر پڑھے لکھے نوجوان کا المیہ ہے، جو حالات کی ابتری کا شکار ہے اور تعلیم یافتہ ہو کر بھی اِس مفلسی میں گھِرے ہوئے معاشرے میں بے بسی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ ناول نگار نے اِس ناول میں پڑھے لکھے نوجوان طبقے کے تصور معاش پر روشنی ڈالی ہے کہ کس طرح اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ سرکاری ملازمت کا حصول چاہتا ہے۔ اِس ناول میں ناول نگار جہاں مختلف تصوارت میں گھِرے ہوئے افراد معاشرے کا تعارف کرواتا ہے وہاں معاشرے کے اُن پوشید گوشوں سے بھی پردہ اٹھاتا ہے جو ہر وقت معاشرے میں کارفرما ہیں، اور جن کی وجہ سے افراد معاشرہ مختلف طرح کے غیر انسانی تصورات کے ساتھ معاشرے میں بگاڑ کا سبب بن رہے ہیں، ناول میں نوجوانوں کے ذریعے وہ معاشرے کے اُس رُخ اور اندرونی خلفشار کو نمایاں کرتا ہے جو دِن بدن تنزلی کا شکار ہو رہا ہے، اور افراد معاشرہ بیمار ذہنی تصورات کو پال کر معاشرے میں مثبت فکری اور معاشی بحران کا سبب بن رہے ہیں، 'امجد" ناول کا وہ نوجوان پڑھا لکھا کردار ہے جو اپنے معاشرے سے بیزار ہے اور اپنی خواہشات کی تکمیل کیلئے وہ یہاں سے نکل کر امریکہ جانا چاہتا ہے، ناول نگار نے اِس کردار کے ذریعے معاشرے کی ناہمواری اور ابتری کا ذکر کچھ یوں کیا ہے:

"یار تم لوگوں نے امریکہ کی کیا رٹ لگائی ہوئی ہے؟ اِس لئے کہ وہاں بہتر کوالٹی آف لائف ہے، میں یہاں رہ کر کیا کروں گا، یہاں کے حالات آپ نے دیکھ لئے ہیں، یہ واحد ملک ہے جو گزشتہ پچاس برسوں سے عدم استحکام کا شکار ہے، ہر بات ایڈہاک بنیادوں پر کی جاتی ہے، پچاس سالوں میں نوجوانوں

کیلئے کیا کیا گیا ہے؟ ہر بات کیلئے سفارش اور رشوت، ہمارے پاس دونوں میں
سے کوئی چیز نہیں ہے، اِس لئے یہاں رہنا بے کار ہے، اگر میں امتحان پاس
نہ کر سکا تو پھر میں کسی دوسرے ملک نکل جاؤں گا وہاں ڈاکٹروں کو ملازمتیں
آسانی سے مل جاتی ہیں۔"(۱۷)

ناول کا یہ کردار معاشرے کے تعلیم یافتہ طبقہ کی سوچ کا عکاس ہے، کہ کس طرح ہر پڑھا لکھا نوجوان اقتدار چاہتا ہے تاکہ وہ ایک اچھی زندگی بسر کر سکے، اقتدار کی ہوس اور اِس کے لئے کوشش یہ سب وجودی تصور ایسے ہیں جو معاشرے کے نوجوان طبقہ کو دِن رات تذبذب میں رکھتے ہیں۔ امجد کئی طرح کے وجودی تصورات کا شکار ہے، وہ پیسہ بھی چاہتا ہے اقتدار بھی، وہ اپنے لئے جینا چاہتا ہے لیکن بوڑھے والدین کو اپنے لئے سہارا نہیں سمجھتا کیونکہ محدود مالی وسائل کی وجہ سے وہ امجد کی آسائشوں کا سامان نہیں کر سکتے، وہ اپنی اِس کمی کی وجہ اپنے دوستوں کے والدین کی جائیداد جو انہوں نے اپنے بچوں کیلئے بنا رکھی ہے اُسے دیکھ کر احساس کمتری کا شکار ہے۔ وہ اپنے والدین پر کُڑتا ہے کہ انہوں نے اسے وہ آسائش اور دولت نہیں دی جو اُس کے دوسرے دوستوں کو ورثے میں ملی ہے۔ اقتباس دیکھئے:

"امجد سہ پہر سے کلینک میں بیٹھا صبح سے اِس مکالمے کے بارے میں کیوں
کرتے ہیں؟ irritate سوچ کر ضعیف ہو رہا تھا، نہ جانے وہ مجھے وہ میرے ماں
باپ ہیں میں اُن کا بُرا نہیں چاہتا لیکن انھوں نے میرے لئے کیا کیا ہے، یہ
سب کچھ ممی کا ہے والد صاحب کالم لکھ کر سمجھتے ہیں کہ انھوں نے تیر مارا ہے،
انھوں نے میرے لئے کیا کیا ہے، پالنا تعلیم دینا کوئی بڑی بات نہیں ہے کوئی
کارنامہ نہیں ہے دوسرے دوستوں کے ماں باپ انہیں پاکٹ منی دے رہے
ہیں، انہیں امریکہ یا لندن بھیج رہے ہیں۔ کوئی بینکاک امتحان دینے جا رہا ہے
ہر کوئی رسک لے رہا ہے اور ادھر ہمیں صبر اور نیکی کے درس ملتے
ہیں۔"(۱۸)

ناول نگار نے اِس نوجوان کردار "امجد" کے حوالے سے معاشرے کے نوجوان طبقہ کی اکلوتی سوچ جس کا وہ مکمل طور پر شکار نظر آتے ہیں کی وضاحت کی ہے اور اِس احساس کمتری کو بڑے پُر اثر انداز میں بیان کیا ہے۔ انیس ناگی کی یہ پرکھ نوجوان طبقہ کے بارے میں ہے کافی حد تک حقیقی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اِس

معاشرے کا پڑھا لکھا نوجوان اپنی تعلیم کے مطابق صلہ نہ ملنے پر معاشرے کا ایک ناکارہ رُکن بنا پڑا ہے، اور حصول معاش کے منفی رویے اُسے گھیرے رکھتے ہیں۔ امجد کہتا ہے مجھے ناکارہ بنا دیا گیا ہے میں ایک کوالیفائیڈ ڈاکٹر ہوں، دو برس گزر چکے ہیں مجھ سے اچھے تو دیہاڑی دار مزدور ہی ہیں جو کچھ تو کماتے ہیں، مجھے یا تو میڈیسن میں ایکسیلنس حاصل کرنی چاہیے یا اِس پیشے کو چھوڑ دینا چاہیے، میں اپنے خوابوں کی کب تک حفاظت کرتا رہوں گا، میں نے ابھی تک حالات کے ہاتھوں پتلی بننے سے انکار کیا ہے، میری صورتحال نہیں بدلی، اگر میں اِس نظام کو قبول کرلوں تو پھر بھی معاملات اسی طرح رہیں گے کونسی ایسی طاقت ہے جو مجھے کچھ کرنے اور نہ کرنے پر مجبور کررہی ہے، میں فیصلہ کرنے کی ہمت رکھتا ہوں، اگر فیصلے کے باوجود صورتحال نہیں بدلی تو ایسے فیصلے کا کیا فائدہ دنیا کی سب سے بڑی نعمت اور طاقت دولت ہے اِس سے ہمارے معاملات شروع اور ختم ہوتے ہیں۔

ناول نگار نے ناول "پتلیاں" میں معاشرے کے ناسور کو مختلف جگہوں سے دکھایا ہے جو کبھی مایوسی اور نااُمیدی کی صورت میں پھیلتا ہے اور کبھی احساس کمتری کے ذریعے معاشرے کے جسم کو کھاتا ہے۔ امجد جو ایک مرکزی کردار ہے، اور ایک متوسط گھرانے کا چشم و چراغ ہے احساس کمتری میں مبتلا ہو کر مختلف وجودی کیفیات سے دوچار ہے یہ احساس محرومی اِس کے ذہن میں کیسے بیٹھ گیا ہے۔

غربت و افلاس کے احساس نے اور امیر دوستوں کی دولت نے امجد کو انتشاری کیفیت میں مبتلا کیا ہوا ہے اور اِسے اِن حالات سے نکلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی وہ اپنے آپ کو ایک بہتر پوزیشن میں دیکھنا چاہتا ہے جہاں زندگی کی آسائشیں ہوں کیونکہ عمر کی جس منزل پر وہ ہے وہاں پر اِس طرح کے احساسات فرد کو گھیر اڈالے رکھتے ہیں۔ وہ طرح طرح کے گمانوں سے نبرد آزما رہتا ہے۔ کبھی امریکہ جانے کی سوچ اِسے بے چین کرتی ہے کبھی وہ اپنی مالی حالت کو دیکھ کر اپنے آپ کو بے یارو مددگار محسوس کرتا ہے اور مایوسی کے حالت میں اُس کے ذہن میں یہ خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ انیس ناگی نے کردار "امجد" کے ذریعے معاشرے کے نوجوان طبقے کے دِل و دماغ میں بننے والی غیر یقینی صورتحال کو بیان کیا ہے کہ یہ طبقہ کس طرح حصول معاش کے حوالے سے سوچ و بچار کے نشیب و فراز سے گزرتا ہے، اور یہ کرب اسے کسی صورت حال پر ٹھہرنے نہیں دیتا۔ نوجوان طبقے کی حقیقی ذہنی عکاسی کی علامت ناول کا کردار "امجد" ہے۔ جو معاشی تنگدستی کی وجہ سے مختلف قسم کی سوچوں کا محور بنا ہوا ہے۔ اقتباس دیکھئے:

"وہ امتحان کی تیاری کر رہا تھا اِس کے ساتھ وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ وہ سائنس سٹوڈنٹ رہا ہے اور امتحان آرٹس کے مضامین کا دے رہا ہے۔ میرے ہر کام میں مداخلت شروع ہو جاتی ہے، مجھے ڈاکٹری کرنی ہے یا افسر بننا ہے؟ لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ میں امتحان پاس کر جاؤں گا یہ فیصلے میں نہیں کوئی اور کر رہا ہے۔ اصل مقصد تو دولت ہے، امجد کلینک میں بیٹھا اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔"(۱۹)

انیس ناگی نے "امجد" کے کردار کے ذریعے متوسط طبقے میں ہونے والی غیر یقینی کی صورتحال اور گھریلو ناچاکیوں کو واضح کیا ہے۔ اور یہ بات ہمارے سامنے رکھی ہے کہ اِس کرپٹ اور اجارا داری والے معاشرے میں جہاں اونچا طبقہ اچھے اچھے عہدوں پر براجمان ہو کر ملک کو دونوں ہاتھوں سے لوٹتا ہے اور متوسط اور غریب طبقہ بنیادی حقوق سے محروم کر دیا جاتا ہے اِس ظلم اور اور ناانصافی میں پستے ہوئے طبقہ کی ذہنی حالت کو عام فہم الفاظ کا جامہ پہنایا ہے۔ کہ غربت و احساس محرومی کا شکار معاشرے کا متوسط طبقہ کس طرح ذہنی انتشار کا شکار ہو کر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو کر بھی بے روز گاری کا سامنا کرنے والا کردار "امجد" کس طرح ذہنی تناؤ کا شکار ہے۔ ناول سے اقتباس دیکھتے ہیں:

"میں خود نہیں گھر بیٹھا بلکہ بٹھایا گیا ہوں، میرا یہی قصور ہے کہ میرے ماں باپ کے پاس کچھ نہیں ہے، اِن کا بھی یہی قصور ہے کہ انہوں نے شریفانہ زندگی بسر کی ہے۔ ڈیڈی میں آپ سے کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ میں زندگی اپنی شرائط پر بسر کروں گا۔ زندگی بار بار تو نہیں ملتی، اگر میں آپ لوگوں پر بوجھ بنتا جا رہا ہوں تو میں یہاں سے چلا جاتا ہوں۔"(۲۰)

دوسرے کرداروں کی طرح امجد بھی مختلف طرح کے وجودی تصورات کی زد میں رہتے ہوئے زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ معاشرے میں معاشی استحصال کا اِس پر گہرا اثر ہے۔ جہاں وہ معاشی آسائش چاہتا ہے وہاں جنسی تصور وجود کا بھی اُس پر اثر ہے جو کبھی کبھی سارے تصورات کو دبا کر غالب آجاتا ہے، ناول نگار نے نوجوان طبقہ کے جنسی تصور کو سیدھے اور سپاٹ طریقے سے ناول کا حصہ بنایا ہے۔ ناول سے ایک اقتباس دیکھئے:

"گزشتہ رات امجد کیلئے ایک طوفان سے کم نہیں تھی، بدن کی خواہش اتنی اڈی ہوئی تھی کہ اسے روکنا بے حد مشکل تھا، کوئی راستہ نہیں تھا، اِس کا کسی کے ساتھ ایسا رابطہ بھی نہیں تھا جو اِس کے اطمینان کا وسیلہ بن سکتی، اِس نے اپنی میز کے دراز میں سے ویلم ٹین کی گولی نکالی اور اسے نگل گیا۔ یہ گولی بھی بہتکم اثر دکھا رہی تھی اسے کچھ یاد آیا تو وہ دبے پاؤں گیلری میں جا کر اپنی پرانی کلاس فیلو شبنم کو ٹیلیفون کیا جو آج کل پوسٹ گریجوئیٹ انسٹیٹیوٹ میں کام کرتی تھی"(۲۱)

"امجد" کا کردار معاشرے کے پڑھے لکھے نوجوانوں کی سوچ و فکر کا المیہ ہے جو حصول معاش کیلئے ہر طرح کے ہتھکنڈے اپنانے کو تیار رہتے ہیں۔ اِس ناول میں امجد کو مختلف تصوارت وجود کا سامنا ہے وہ اِن تصوارت میں باری باری سفر کرتا ہے جب وہ ہر طرف سے ناکامی کی صورت کا سامنا کرتا ہے تو اُس کے ذہن میں معاشی تنگدستی دور کرنے کا جو تصور ابھرتا ہے وہ یہ کہ کیوں نہ کسی بڑے گھرانے کی لڑکی کو سیڑھی بنایا جائے۔ اُس سے شادی کر کے امریکہ جا کر دولت کمانے کا خواب شرمندہ تعبیر ہو سکے۔ اِس کردار کے ذریعے ناول نگار نے معاشرے کے نوجوان طبقہ چاہے وہ تعلیم یافتہ ہوں یا ناخواندہ کی ذہنی عکاسی کی ہے کہ کس طرح معاشی بحران سے نکلنے کیلئے بیرون ممالک جانے کا طریقہ اپناتے ہیں۔ یہ پہلو ہمارے معاشرے کے افراد کی معاشی کسمپرسی کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ نوجوان طبقہ اپنی خواہشات کو بھول کر تشنگی کو دور کرنے کیلئے بیرون ممالک دولت کے حصول اور پُر آسائش زندگی کیلئے ہر ممکن و ناممکن ذریعہ کو اپناتا ہے۔ "امجد" کے خیالات اسی حوالے سے ناول کے ایک اقتباس کا حصہ ہیں:

"امجد کی نگاہوں میں میڈیکل کالج کے پانچ برس ایک بھاگتی ہوئی فلم کی طرح گزرنے لگے، تھرڈ پروفیشن میں اِس کی اور رعنا کی دوستی ہوئی تھی اور اسے حیرت بھی ہوتی تھی کہ وہ معمولی شکل کا شخص تھا نہ جانے رعنا کو اِس کی کونسی بات اچھی لگی تھی ان کی دوستی زیادہ کالج کی کنٹین تک محدود تھی باتوں باتوں میں امجد کو معلوم ہوا کہ رعنا کے والدین اس کے ایسا لڑکا چاہتے ہیں جو شادی کے بعد امریکہ سیٹل ہو جائے اور اِن کا کاروبار بھی سنبھال لے ۔لیکن وہ اِس کے ساتھ اپنا کام بھی کرے۔"(۲۲)

یہ ناول کا ایک ایسا کردار ہے جسکی ذات بکھری پڑی ہے اور کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ حالات کے جبر و تشدد اِس کے سامنے دیوار بنے کھڑے ہیں ۔ناول نگار نے اِس کردار کے ذریعے معاشرے کے جن پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے وہ کسی حد تک درست ہے لیکن نامکمل ہے۔ پھر بھی امجد کا کردار ناول کا ایک جاندار کردار ہے۔

ب۔ ضمنی کردار

انیس ناگی نے اپنے ناولوں میں عشق و محبت کے فرسودہ موضوعات کی بجائے معاشرے کے ٹھوس حقائق کو جگہ دی ہے ۔اُن کے ناول جدید عہد کے فرد کی کرب ناک داستان ہیں کہ کس طرح جدید عہد کا انسان سیاسی و سماجی بحران کا شکار ہے۔ معاشرتی واخلاقی اور مذہبی بحران نے وجودیت کے فلسفے کو تشکیل دیا اور وجود کی جانب مبذول ہو کر انسان نے داخلیت پر انحصار کرنا شروع کیا اور مسائل کا حل تلاش کیا۔

انیس ناگی نے ناول کے دوسرے کرداروں کے ذریعے معاشرے کے کسی نہ کسی پہلو کو سامنے رکھا ہے۔ وجودیت کس طرح سے معاشرے کے افراد کو اپنے حصار میں لئے چلتی ہے آیئے ناول کے دوسرے کرداروں کا جائزہ لیتے ہیں۔

احمد

احمد بھی ڈاکٹری کی ڈگری رکھنے والا ایک بے کار نوجوان ہے، لیکن اِس کی نوعیت امجد سے قدرے مختلف ہے کیونکہ اِس کے والدین سرکاری ملازمتوں پر بڑے عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں، اور ہر جائز اور ناجائز طریقے سے دولت کما کر امیر طبقہ میں شمار ہوتے ہیں۔ ناول نگار اِس کردار کا تعارف اس طرح کرواتا ہے:

> "احمد ایک سفید گول مٹول نوجوان ہے وہ بھی اِسی کالونی میں رہتا ہے گزشتہ سال اِس کا باپ ریٹائر ہوا ہے، وہ انجینئر تھا، ریٹائر ہونے کے وقت اِس کے پاس شہر میں چار پلاٹ اور دو کروڑ سے زیادہ رقم تھی۔ اس کے دو بیٹوں نے امریکہ میں تعلیم حاصل کی ہے۔ اِس کی ماں ٹیکنیکل ادارے میں افسر ہے، احمد کا باپ ایک شاطر افسر تھا اِس نے ریٹائر ہونے سے پہلے اپنی رہائش کو اپنی بیوی کے نام منتقل کروادیا ہے، وہ شام کو گولف کھیلتا ہے اِس کی ماں بہت سی عورتوں کی سوسائیٹیوں کی ممبر ہے، اسے اپنے تینوں بیٹوں میں سب سے زیادہ محبت احمد سے ہے۔"(۲۳)

انیس ناگی نے اِس کردار اور اِس کے افراد خانہ کا تعارف کچھ اِس طرح سے کروایا ہے کہ معاشرے کے دولت مند طبقہ کے حوالے سے کچھ حقیقی تصورات پیش کیے ہیں۔ اِس طبقہ کی بدعنوانیوں کی طرف اشارہ کیا ہے، اور حصول دولت کیلئے ناجائز ذرائع کا سہارا لینا کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

پھر ایسے خاندانوں کی اولاد کے تصور وجود کے بارے میں ناول میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح ایسے افراد انفرادی طور پر وجودیت پرستی میں زندگی گزارتے ہیں ، اور ایسے افراد اپنے سے نیچے والے طبقہ کے بارے میں کس طرح کے خیالات رکھتے ہیں، احمد جو ایک امیر ماں باپ کا عیاش بیٹا ہے اپنی حوس کا نشانہ بناتا، اور اِس کا باپ اپنے بیٹے کے اِس کام کی وجہ سے خوش ہوتا۔ اِس کردار کے ذریعے ناول نگار نے معاشرے کے پیسے والے طبقہ کی معاشی حصول کیلئے کی جانے والی وجودی کیفیت کا ذکر کیا ہے اور اُن کی اولاد کی جنسی بے راہ روی کا ذکر کیا ہے اور ساتھ ساتھ ایسے طبقے کی عورتوں کی سوچ کی عکاسی بھی کی ہے جو وہ اپنے سے نیچے والے افراد کے بارے میں رکھتی ہیں۔ احمد کے والدین جب اپنے بیٹے کے کارناموں کی وجہ سے مجبور ہو کر بد نامی کے ڈر سے احمد کی شادی اسی لڑکی سے کر دیتے ہیں جس سے وہ جنسی زیادتی کر تا رہا تھا تو احمد کی ماں احمد کی بیوی کے بارے میں کیا خیالات رکھتی ہے۔ اِس حوالے سے اقتباس دیکھتے ہیں:

> "احمد کی ماں اپنے بیٹے سے ناراض ہو گئی اور اِس کی بیوی پر طرح طرح کی سختیاں کرنے لگی کہ اس نے اسکے بیٹے کا مستقبل لوٹ لیا تھا، وہ ایک کنگلے خاندان سے تھی اور اپنے ساتھ چار جوڑوں کے علاوہ کوئی جہیز بھی نہ لا سکی تھی۔" (۲۴)

انیس ناگی نے ایسے افراد اور اِن کے اہل خانہ کے وجودی تصورات کے ذریعے یہ بات واضح کی ہے کہ کس طرح معاشرے کا دولت مند طبقہ معاشی جنسی وجودیت کا حامل ہو کر معاشرتی قدروں اور اپنے ساتھ جڑے رشتوں کا استحصال کرتا ہے۔

انور

ناول کا یہ کردار ایک ریٹائرڈ ڈاکٹر کا بیٹا ہے جس نے سرکاری ہسپتالوں میں کام کر کے وافر کیش جمع کر کے جائیدادیں بنائی ہیں، اور آج کل وہ اپنے باپ کے پیسے کھلے دِل سے خرچ کر رہا ہے۔ انیس نے اِس کردار کے ذریعے ایک تو نوجوان طبقے کی لاپرواہی اور فضول خرچی کی طرف اشارہ کیا ہے دوسری طرف ڈاکٹری پیشہ میں آنے والے افراد معاشرہ کی بدعنوانیوں کا مختصر تعارف کروایا ہے۔

ابرار

یہ بھی امجد کا دوست ہے ایک وکیل کا بیٹا ہے اِس کی روٹین بھی اپنے دوسرے ساتھیوں سے ملتی ہے۔ پڑھا لکھا بے کار ہے اور اپنے سب ساتھیوں کی طرح حالات سے مجبور ہو کر کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر ہے۔ اگر اِن نوجوان کرداروں کی ذہنی صورتحال کو دیکھا جائے تو پتا چلتا ہے کہ یہ سب کردار پتلیاں ہیں جو حالات کے سمندر میں تیرتے ہوئے لکڑی کے خشک ٹکڑوں کی طرح ہیں جن کو موجیں کبھی کناروں سے دور لے جاتی ہیں کبھی بھنور میں ڈبو دیتی ہیں، وجودیت اِن نوجوانوں کے دِل و دماغ میں پیوست ہو چکی ہے جو معاشرتی حالات کی پیدا کردہ ہے، وجودیت کے حوالے سے ڈاکٹر سی۔ اے قادر لکھتے ہیں:

> "وجودیت کا فلسفہ تنہائی اور بیگانگی کا فلسفہ ہے یہ اِس دور کی پیداوار ہے جب انسان اپنی اقدر کھو بیٹھتا ہے۔ مذہب سے مایوس ہو چکتا ہے اور اِسے ہر طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آتی ہے، یہ دور یورپ میں دو عالمی جنگوں سے پیدا ہوا۔ انسان وحشیوں اور درندوں کی طرح لڑا۔ ہر قدر کو ٹھکرا دیا گیا، نہ اخلاق کا پاس رہا نہ مذہب کا اِس سوال کا جواب وجودیت نے پیش کیا۔"[۲۵]

دوسرے وجودیت پسند ادیبوں کی طرح انیس ناگی نے بھی فرد کی آزادی کو ایک قدر کے طور پر پیش کیا اور صبر، انتشار، بے چینی، کرب اور تشدد کو اپنی تحریروں کا حصہ بنایا، اور ناول 'پتلیاں" کے نوجوان کرداروں کو اِس طرح پیش کیا کہ وہ ہر لمحہ اپنے آپ کو نئے موقف ایک نئی صورتحال کا شکار پاتے ہیں۔

رحمت

ناول کا یہ کردار ایک معمولی کردار ہے جو دور دراز ایک دیہات کا رہنے والا ہے اور شہر میں آکر نوکری کرنے پر مجبور ہے، ناول نگار نے اِس کردار کے ذریعے ہمارے معاشرے کی ایک پرانی تصویر کو ہمارے سامنے رکھا ہے، کہ کس طرح فرسودہ رسم و رواج ہمارے معاشرے کے لوگوں کا استحصال کرتے ہیں۔ رحمت ناول کا ایک ایسا نوجوان کردار ہے جس کے ذریعے ناول نگار نے معاشرے کے ایک نوجوان طبقہ کی مجبوری کے تحت گزرنے والی زندگی پر روشنی ڈالی ہے جو اپنے لئے بہت کم اور ساتھ جڑے ہوئے رشتوں کیلئے زندگی زیادہ گزارتے ہیں۔ ناول نگار اِس کردار کے بارے میں ناول میں لکھتا ہے:

> " رحمت کی کہانی بھی ایک پسماندہ خطے کی کہانی ہے وہ آزاد کشمیر کے ایک گاؤں باغ کا رہنے والا ہے۔ رحمت سے پہلے اِس کا چچازاد بھائی بشیر جمیل کے

گھر میں کام کرتا تھا۔ ایک سال کے بعد جمیل کے گھر کام کرتے کرتے اِس کی طبیعت اکتا گئی اور جانے سے پہلے وہ رحمت کو یہاں چھوڑ گیا، وہ نشیلی آنکھوں والا بیس سالوں کا دبلا پتلا نوجوان ہے جو بہت کم گو ہے، رحمت کی کہانی صرف اِس کی نہیں یہ ان تمام لڑکوں کی کہانی ہے جو سینکڑوں کی تعداد میں رزق کی تلاش میں بڑے شہروں میں پھیلے ہوئے ہیں اور کسی کام میں عار نہیں سمجھتے۔"(۲۶)

جہاں ناول کے دوسرے کردار وجودی کرب سے گزر رہے ہیں، یہ کردار وجودی کرب میں مبتلا ہے لیکن اِس کردار کا وجودی کرب اپنی ذات کے حوالے سے نہیں ہے بلکہ اپنے ساتھ جڑے ہوئے رشتوں کے حوالے سے ہے ناول نگار نے اِس کردار کے ذریعے معاشرے کے ایک نوجوان طبقہ جو غربت و بیروزگاری سے تنگ آکر اور اپنے اور اپنے ساتھ جڑے رشتوں کو نبھانے کے لئے زندگی کی سختیوں کو جھیلتے ہیں کو نمایاں کیا ہے، یہ کردار معاشرے کی ایک ایسی تصویر ہے جس کو وجودیت کے حوالے سے پرکھنا اہمیت رکھتا ہے۔

شاہ صاحب

یہ کردار دوہری شخصیت رکھنے والا ناول کا ایک اہم کردار ہے، اور ناول نگار نے اِسے اِس کی چھپی ہوئی شخصیت کے ساتھ نمایاں کیا ہے، انیس ناگی ایک اہم وجودیت پسند ناول نگار ہے۔ اِس کے ناولوں میں وجودیت کے بہت سارے رنگ بکھرے ہوئے ہیں ناول نگار ایک ماہر مصور کی طرح معاشرے کے جس پہلو کو بھی نمایاں کرتا ہے کرداروں کے ساتھ اُس پہلو کی ایک پُر اثر منظر کشی بھی ساتھ کرتا چلا جاتا ہے، جس سے ناول نگار کے بتائے ہوئے تصور کی وضاحت نہ صرف کردار کی بات چیت سے نمایاں ہو جاتی ہے بلکہ اُس تصور کو سمجھنے کیلئے بنایا گیا ماحول بھی کارگر ثابت ہوتا ہے۔ اِس کردار کے ذریعے جس کا اصل نام چودھری اللہ دتہ ہے جو ایک پولیس آفسر کی ڈیوٹی سے نکالے جانے پر اپنا ظاہری بھیس چھپا کر درویش کا روپ دھار چکا ہے، جس کے ذریعہ وہ اپنے مطلوبہ مقاصد کی تکمیل میں عمل پیرا ہے۔ ناول نگار نے اِس کردار کے ذریعے معاشرے کے اُن ارکان کی طرف اشارہ کیا ہے جو ضعیف الاعتقاد لوگوں کی معصومیت کا فائدہ اٹھا کر نا صرف کھلا پیسہ بٹورتے ہیں بلکہ معاشرے میں تخریب کاری میں بھی ملوث رہتے ہیں، تعویز دھاگوں کا ڈھونگ رچا کر معاشرے کے مایوس طبقہ کو ذہنی غلام بناتے ہیں۔ ناول کا کردار جمیل اِن کے بارے میں کیا کہتا ہے، دیکھئے:

"شہر میں اِس قسم کے پیر فیشن ایبل علاقوں میں بڑی بڑی کوٹھیاں کرائے پر
لے کر لوگوں کا روحانی علاج کر رہے ہیں ہر کوئی کہتا ہے کہ اسے پیسے کی لالچ
نہیں ہے، اگر نہیں ہے تو پھر یہ سارا کاروبار کیسے چلتا ہے۔"[۲۷]

انیس ناگی نے اِس کردار کے ذریعے معاشرے کے ایک حقیقی رُخ کو واضح کیا ہے جس کو نظر انداز تو کیا جاسکتا ہے جھٹلایا نہیں جاسکتا، معاشرے میں ہونے والی کرپشن عوام کو دھوکا دے کر اقتدار کی مسند پر براجمان ہونے والے طبقہ کو خیرات کہاں کہاں سے ملتی ہے اُس کا ایک رُخ یہ کردار ہے، جو ایک بناوٹی درویش ہے لیکن حقیقتاً سیاسی پشت پناہی کرتا ہے، یہ کردار ہمارے معاشرے کی ایک حقیقی کہانی ہے اُن لوگوں کی کہانی جو ناجائز دولت کے حصول اور اقتدار پر قائم رہنے کیلئے ایسے سیاسی اڈوں پر ماتھا ٹیکتے ہیں، جہاں پیروں کے روپ میں سیاسی دلال اُن کی خواہشات کو پورا کرنے کا ڈھونگ رچاتے ہیں، ناول سے اقتباس دیکھئے:

"شاید ایسا ہی ہے جن لوگوں نے ناجائز دولت اکٹھی کی ہے، جو لوگ سیاسی
عہدوں پر قائم رہنا چاہتے ہیں، جو لوگ کرپٹ ہیں انہیں پیروں کی ضرورت
ہے۔ دیکھو اِسہال میں کوئی غریب بیٹھا نہیں ہوا۔ غریب کے صبح و شام ایک
جیسے ہوتے ہیں اِسلئے انہیں پیروں فقیروں کی ضرورت نہیں ہوتی، اِس ہال
میں تین چار بیوروکریٹس کو جانتا ہوں جو او ایس ڈی ہیں اور اپنی پوسٹنگ کیلئے
پیر صاحب کی مدد چاہتے ہیں۔"[۲۸]

انیس ناگی نے وجودیت کے حوالے سے معاشرے کے ایک بڑے حصے کی ذہنی کمزوری کو ناول کے اِس کردار کے حوالے سے بیان کا ہے، اور ساتھ ساتھ اِس بات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ اِس طرح کے روحانی مرکز کس طرح عورت اور نوجوان لڑکیوں کو روحانیت کا جھانسہ دیکر جنسی زیادتی کا نشانہ بناتے ہیں، ناول کا ایک نسوانی کرادر جمیل کو اِس حوالے سے کیا کہتا ہے۔ دیکھئے:

"جمیل صاحب اِس ڈیرے پر ملازم لڑکیوں کے ساتھ کیا زیادتیاں ہوتی ہیں
بس اللہ ہی جانتا ہے۔"[۲۹]

انیس ناگی کے ناول "پتلیاں" کے مختلف کرداروں کو دیکھا جائے تو ہر کردار وجودی کشمکش میں مبتلا ہے، اِس ناول کے بعض کرداروں کی وجودی صورتحال سے فوراً اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی موجودہ صورتحال سے آزادی چاہتے ہیں، اور اُن کی موجودہ صورتحال کے پیچھے اِن کے تصور اور ارادے کا بھی ہیں، یہ بات کہ

وجود نیا سے مربوط ہوا کرتا ہے اور اِس کے فیصلے اِس کے موضوع سے جنم لیتے ہیں اسی حوالے سے سارتر کہتا ہے:

"انسان فقط ہے اِس کے ہونے میں اِس کے تصور کو ہی دخل نہیں بلکہ ارادے کا بھی ہاتھ ہے، انسان کچھ نہیں سوا اِس کے جو کچھ کہ وہ اپنے آپ کو بناتا ہے۔"(۳۰)

انیس ناگی نے مروجہ ضابطوں اور روایتی اقدار سے انحراف کرتے ہوئے ادب اور فلسفہ میں نئے منظروں کو تراشا اور نئی جہتوں کو دریافت کرنے کی کوشش کی۔

شہباز

یہ کردار ناول میں اپنی ایک الگ اہمیت رکھتا ہے۔ جو اخبار میں کالم لکھنے کا کام کرتا ہے، جو ایک کرائم رپورٹر بھی ہے، اخبار کے سارے عملے میں ہر دل عزیز ہے، جو اخبار کی نوکری کرنے کے ساتھ ساتھ چودھری اللہ دتہ عرف جعلی پیر کیلئے بھی کام کرتا ہے، اور اِس بات پر خاص دھیان دیتا ہے کہ اخبار میں شاہ صاحب کے خلاف کوئی خبر شائع نہ ہو جس سے وہ بے نقاب ہو جائے، اور اِس کے عوض وہ شاہ صاحب سے معاوضہ وصول کرتا ہے۔ انیس ناگی نے اِس کردار کے ذریعے معاشرے کا ایک خفیہ رُخ واضح کیا ہے کہ مختلف محکموں سے تعلق رکھنے والے ملازم اور آفیسر پیسے کے لالچ میں بڑے بڑے نامی گرامی لوگوں کیلئے کس طرح کام کرتے ہیں، اور اپنی نوکری کی آڑ میں کس طرح کرپٹ لوگوں کی چمچا گیری کرتے ہیں۔

خواجہ صاحب

خواجہ صاحب ناول کا ایک سیاسی کردار ہے، جو مال و دولت ہونے کے ساتھ ساتھ اقتدار چاہتا ہے، وہ پیشہ صحافت سے وابستہ افراد کو دولت کے عوض خرید کر اخبار میں اپنی جھوٹی تشہیر کروانا چاہتا ہے تاکہ عوام میں ہر دل عزیز ہو کر اقتدار کی مسند پر جا بیٹھے اور دل کھول کر روپیہ اکٹھا کرے۔ اِس پیشہ سے منسلک افراد افواہیں اور جھوٹی خبریں شائع کر کے زیادہ سے زیادہ دولت کماتے ہیں، اور معاشرے میں معاشی لوٹ کھسوٹ میں ملوث ہیں۔ معاشرے کے اِس المیہ کو انیس ناگی ناول "پتلیاں" میں یوں بیان کرتے ہیں:

"یار یہ بلیک میلنگ ہے، نہیں یہ سوداگری ہے، شرافت سے صحافت اور صحافت سے ثقافت ہمارا یہی موٹو ہونا چاہیے، پیارے صحافت میں یہی چلتا ہے، ہم تو

اپنا مختتانہ طلب کرتے ہیں، اب جھوٹ اور سچ میں فرق ختم ہو گیا ہے جو چاہو لکھو ، ہمیں کیا خواجہ اپنے پاس سے پلاٹ دے یا کہیں سے الاٹ کروادے، یہ اسکا مسئلہ ہے وگرنہ دوسری سیاسی پارٹی بھی تیار ہے، یہاں کوئی بھی اخبار کی مدد کے بغیر اقتدار میں نہیں آسکتا۔"(۳۱)

مذکورہ کرداروں کے علاوہ کچھ اور کردار بھی ہیں جو ناول میں بہت مختصر تعارف کے ساتھ موجود ہیں لیکن وجودیت کا عنصر اُن کرداروں سے بھی ملتا ہے، مثلاً علی جمیل کا ہم پیشہ ہے ایک صحافی اور کالم نگار ہے یہ بھی ایک وجودی کردار ہے جو پیشہ صحافت کی آڑ میں ناجائز کماتا ہے اور عیاشیوں میں خرچ کرتا ہے۔

عمران ایک ایسا کردار ہے جو پروین کا ہم جماعت رہا ہے امیر باپ کی اولاد ہے، پروین اسے پسند کرتی ہے لیکن عمران اپنے تعلق کو مستقل نہیں بنانا چاہتا۔ انیس ناگی ناول کے ضمنی کرداروں کے ذریعے وجودی تصورات کو کسی حد تک واضح کرنے میں کامیاب نظر آتا ہے ، لیکن اِس کے کچھ کردار اپنے ماحول اور تصور وجود کے ساتھ مکمل مطابقت نہیں رکھتے، لیکن کچھ حد تک مطابقت رکھنے کی وجہ سے اہمیت کے حامل ہیں۔

ج۔ نسوانی کردار

تصورات وجود کے مختلف گوشوں کو نمایاں کرنے کیلئے انیس ناگی نے ایک پُر اثر قلم کار کی حیثیت سے مختلف کرداروں کے ذریعے معاشرے کے افراد کی ذہنی کشمکش کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ جہاں ناول کے دوسرے کردار اہمیت کے حامل ہیں وہاں نسوانی کرداروں کے ذریعے منفرد اور پُر اثر انداز میں یوں بیان کیا ہے کہ وہ حقیقت کے بہت قریب نظر آتے ہیں۔ جمیل کو اِس طرح پیش کیا کہ دنیا کو پڑھنے والا اُس سے حقیقی تاثر لئے بغیر نہ رہ سکے اِس حوالے سے انیس ناگی اُن چند اہم ناول نگاروں کی صف میں شامل ہیں جن کی تحریریں حقیقت کا عکس لئے ہوے ہیں۔ آیئے ناول کے چند نسوانی کرداروں کا جائزہ لیتے ہیں۔

راحت

راحت کا کردار معاشرے کے بہت سارے خاندانوں کی عورتوں کا عکس حال ہے، یہ ایک ایسا کردار ہے جو ایک نہیں کئی قسم کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ اپنی خاندانی زندگی، معاشی فکر اور احساس محبت اِس کردار کے کرب کی وجہ ہیں۔ انیس ناگی اِس کردار کے بارے میں لکھتے ہیں راحت آزادی چاہتی تھی، اِس کی

دس بارہ برسوں کی ازدواجی زندگی مصیبتوں سے بھری ہوئی تھی، اِس نے پسند کی شادی کی تھی ماں باپ اور بھائیوں کی مخالفت مول لی تھی، اِس خیال سے کہ وہ دونوں مل کر بہتر زندگی تعمیر کریں گے، شادی کے چند مہینوں کے بعد ہی اِس کا خواب ٹوٹنے لگا تھا محض ایک سراب تھا، وہ کوئی کام کاج نہیں کرتا تھا، اُس سے ہمیشہ یہی کہتا اِس کا کام گارمنٹس کی ایکسپورٹ کا ہے۔ چند ماہ وہ اِدھر اُدھر سے پیسے پکڑ کر گھر کا خرچ چلاتا اور بعد میں اِسے مسلسل گھاٹے پڑنے لگے اور پھر اتنے گھاٹے پڑے کہ اِسکا گزارہ راحت کی تنخواہ کا محتاج ہو گیا تھا۔

انیس کا یہ ناول وجودی حوالے سے اس لئے اہمیت کا حامل ہے کہ اِس کے تمام کردار بوجھل، تھکی ہوئی بے ثمر زندگی کا بوجھ اٹھاتے وقت کے بے رحم ہاتھوں میں پتلیاں بنے نظر آتے ہیں جس کی ڈور حالات کے ہاتھوں میں ہے اور حالات ہمیشہ انسان سے زیادہ طاقتور ہوتے ہیں۔ زندگی بذات خود کسی عذاب سے کم نہیں۔ انیس ناگی نے اپنے اِس ناول میں ایک عہد جیتی جاگتی زندگی کو "پتلیاں" کا موضوع بنایا ہے۔ اِس ناول کے بارے میں غلام حسین ساجد لکھتے ہیں:

> " اِن کے ناول ہم عصریت کی 'بوباس" ہی سے محلو نہیں اپنے عہد کی سانس لیتی اور ہر لمحہ بدلتی ہوئی زندگی کے پوری طرح امین ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ انیس ناگی "روح عصر" کی تلاش میں نکلنے اور اِس کی تصویر کھینچ دینے کے دعوے دور بھی نہیں ناول کا آغاز ہوتے ہی وہ کسی عام سی گلی، راہ داری یا راستے سے شہر کے قلب میں داخل ہوتے ہیں اور واقعات خود بخود اِن کے وجود پر وارد ہونا شروع ہوتے ہیں ان کے کردار دھوپ، ہوا اور سائے کی طرح موجود سے نمود کرتے ہیں۔" (۳۲)

راحت کا کردار ہمارے معاشرے کی ایک المناک تصویر ہے، جس کے پس منظر میں معاشرے کی ہزاروں عورتیں زندگی کی کٹھن حقیقتوں کا سامنا کرتے ہوئے زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ راحت ایک ایسا کردار ہے جو مردوں کے ہاتھوں ظلم کا نشانہ بننے والی عورتوں کی نمائندگی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اولاد کی معاشی سرپرستی کا ذمہ مرد پر ہوتا ہے، لیکن ناول نگار نے یہ بات واضح کی ہے کہ کس طرح معاشرے کے مرد اولاد کو بے یارومددگار چھوڑ کر عورت کی کفالت میں دے دیتے ہیں اور اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کیلئے نیا گھر بسا لیتے ہیں۔ انیس ناول میں ایک جگہ راحت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ نہ چاہتے ہوئے بھی راحت نے نسیم کو ٹیلیفون کیا تھا کہ وہ اِس کی بچیوں کو اِس کے باپ کے گھر پہنچا دے جہاں اِس کی ماں دو دنوں سے مقیم تھی وہ اپنے

لئے تنہائی چاہتی تھی، اِس لئے کہ اسکی ماں بہت روک ٹوک سے کام لیتی تھی کہ اِس کی ماں اسکے بدن کی بدلتی ہوئی حالت کو شک کی نگاہ سے نہ دیکھے۔ اِس کی ماں جانا نہیں چاہتی تھی لیکن راحت کے اصرار پر اسے وہاں جانا پڑا، کیونکہ یہ راحت کا گھر تھا، وہ اپنی بچیوں سے بھی تنگ آتی جارہی تھی کیونکہ اِن کو حاصل کرنے کیلئے اِس نے عدالتی جنگ بھی لڑی تھی، پھر اسے خیال آیا کہ بچے تو پیدا کرنے والے کے ہوتے ہیں، وہ تو محض ایک کھیتی ہے جس کا کام پیدا کرنا ہے اور اِس کی نگہداشت تو پیدا کرنے والے کو کرنی چاہیے، وہ اپنی تنہائی سے بچنے کیلئے اپنی بچیوں کو حاصل کرنا چاہتی تھی، اِس نے ایک ہفتے پہلے اسے ٹیلیفون کیا تھا کہ وہ اپنی بچیوں کو لے جائے اِس نے جواب دیا تھا، اِن بچیوں کو اپنے پاس رکھو، اِن کی پرورش کرو اور شادی بیاہ کیلئے پیسے جمع کرو، میں اپنی نئی زندگی شروع کرنا چاہتا ہوں، مجھے ڈسٹرب مت کرو۔

تیسری دنیا کے معاشروں میں بے رحمیوں، سفاکیوں، ظلم و ستم کی نئی نئی داستانیں ترتیب پاتی رہتی ہیں، جہاں رہنے والا مضبوط طبقہ اِس طرح بیگانہ ہو جاتا ہے کہ زندگی ایک خود اذیتی کا روپ دھار لیتی ہے اور موت کو ترجیح دینے لگتے ہیں۔ اِس سماج میں انسان اپنی مرضی سے آزاد زندگی گزارنے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا۔ راحت اسی طرح اپنی آزادی کے خواب من میں لئے خودکشی کرلیتی ہے، گویا ایک حبس زدہ ماحول اور گھٹن زدہ زندگی اِس معاشرے کے لوگوں کا مقدر بن جاتی ہے، جو اِن زنجیروں کو توڑنے کی کاوش کرتا ہے وہ خود فنا ہو جاتا ہے، انیس ناگی نے بڑی چابکدستی سے اِس عہد کی تصویر اپنے ناول "پتلیاں" میں پیش کی ہے جہاں تیسری دنیا ایک المیہ ہے جہاں شخص کی آزادی ایک التباس ہے۔

نشاط

ناول کا یہ کردار عورتوں کی ایک الگ نفسیات کا خلاصہ ہے۔ نشاط زندگی کی حقیقت کا سامنا کرتے ہوئے اُکتا جانے والی ایک عورت ہے جس نے زندگی کو اپنے خیالات کے مطابق نہ پایا تو مایوس ہو کر اپنی ذات کے خول میں بند ہو کر رہ گئی۔ یہ کردار ایک الگ وجودی تصور رکھتا ہے ناول نگار نے اِس کردار کے ذریعے معاشرے کے بے رحم ہاتھوں میں پستی ہوئی بہت ساری عورتوں کی داستان بیان کی ہے۔ ناول نگار اپنے ناول میں نشاط کے حوالے سے یوں لکھتے ہیں:

> "نشاط جب ماسٹرز کررہی تھی تو جمیل نے اڑتی اڑتی بات سنی تھی کہ وہ کسی ڈاکٹر سے شادی کرنا چاہتی تھی لیکن ڈاکٹر کے بہت زیادہ تقاضے تھے، وہ کورٹ شپ کے بہانے فلرٹ کرنا چاہتا تھا، وہ اِس پر احسان بھی جتاتا تھا کہ وہ اِس

سے شادی کرنا چاہتا ہے اگر چہ بیشمار لڑکیاں اِس کے تعاقب میں ہیں۔نشاط کو یہ بات اچھی نہ لگی وہ ڈاکٹر کو ایک خاص جذباتی حالت میں دیکھتی تھی لیکن ڈاکٹر کچھ اور چاہتا تھا، دونوں کے پرسپشن میں فرق تھانشاط کالج میں پڑھاتی تھی، اِس کا ایکسپوژر عام گھریلو عورتوں کی نسبت زیادہ کشادہ تھا، اِس واقعہ کے بعد وہ مردوں سے اتنی پیچھے ہٹ گئی کہ وہ صرف عورتوں کی جنس میں رہنے کو ترجیح دیتی۔"(۳۳)

ناول کے ہر کردار کے اُوپر وجودیت کا ایک الگ تصور موجود ہے وہ یا تو اُس کا اپنا پیدا کیا ہوا ہے یا حالات و واقعات نے اُسے اُس میں مبتلا کیا ہے، ناول نگار نے وجودیت کے باعث پیدا ہونے والی اندرونی الجھنوں اور بیرونی خدشات کو اور تصورات وجود کی اُلجھی ہوئی ڈور کو اپنے انداز میں سیدھا کر کے دیکھانے کی کوشش کی ہے، اِن سب باتوں میں مرکزی کردار انسان کی ہستی کا ہے ہستی ہو گی تو اسے ہر حال میں انتخاب اور فیصلے کے عمل سے گزرنا ہو گا، بقول کارل جیسپر:

"انتخاب مقصد کی کشاکش کا نتیجہ نہیں، نہ ہی عقلی جمع تفریق کی پیداوار ہے اور نہ ہی قانون کی اطاعت ہے یہ میری انتہائی اندرونی ذات کا اظہار ہے۔"(۳۴)

ناول نگار نے مختلف کرداروں کے ذریعے سے معاشرے میں رہنے والے افراد کی جو ذہنی و جذباتی تصویر کشی کی ہے، اُس کے کچھ پہلو حقیقت کے قریب اور کچھ حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔ نشاط کا کردار ایک اندرونی خلفشار میں ڈوبا ہوا کردار ہے، جو معاشرے میں رہنے والوں کے متضاد رویوں سے دستبردار ہو کر گوشہ نشیں ہو گیا۔ اپنی جگہ پر ناول کا یہ کردار ایک مناسب کردار ہے۔ جو نسوانی نفسیات کا ایک پرت ہے۔

ریپشنسٹ

ناول کا یہ کردار معاشرے میں وڈیرا شاہی اور صاحب اقتدار طبقہ کی غلامی میں نسل در نسل رہنے والی افراد کی داستان ہے۔ جو نام نہاد وڈیروں اور سیاسی اثرورسوخ رکھنے والے معاشرے کے افراد کی غلامی میں نسل در نسل پستے ہیں۔ وجودیت کا یہ رُخ بھی ناول میں اِس کردار کے حوالے سے بیان ہوا ہے۔

نرگس

وجودیت کس طرح شخصیت پر اثر انداز ہو کر اُسے درست سمت سے ہٹا دیتی ہے اور راہ راست سے دور کر کے گناہوں کی دلدل میں دھکیل دیتی ہے، نرگس کا کردار ناول کا ایک ایسا کردار ہے جو غربت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اور افراد معاشرہ کے ظلم و ستم کا نشانہ بن کر ایک اچھی زندگی سے محروم ہو جانے والی ایک عورت کی کہانی ہے۔ جو ایک داشتہ کے روپ میں معاشرے کا حصہ ہے، نرگس ایک ایسا کردار ہے جو ہمارے معاشرے کے بہت سے نسوائی کرداروں کا المیہ ہے جن کو ناچاہتے ہوئے بھی ایک ایسی زندگی ملی جس کی وہ طلب گار نہ تھیں ناول کی خصوصیات کو اگر دیکھا جائے تو وجودیت کے حوالے سے یہ ناول ایک اچھا ناول ہے لیکن ناول نگار نے ناول کے کچھ اُصول و ضوابط سے چشم پوشی کی ہے، جن کی بنا پر یہ ناول ایک مکمل ناول کے دائرے میں نہیں آتا۔ ایک اچھے ناول میں کیا خصوصیات ہونی چاہیئے بقول اسلام سندھیلوی:

> "ناول حیات کی تصویر بھی ہے اور تفسیر بھی، ناول میں انسانی جذبات کی عکاسی ہو اور مسائل کا حل پیش کر رہا ہو، مقصدی اور اصلاحی ہونے کے علاوہ تفریح کا باعث ہو کردار نگاری اور مزاح نگاری سے آراستہ کیا گیا ہو ناول کا قصہ عام زندگی کا قصہ ہو۔"(۳۵)

نرگس معاشرے میں صنف نازک کی بے بسی کی ایک داستان ہے جو معاشرے کے بے رحم ہاتھوں میں پتلی ہے۔ یتیمی اور غربت کا دکھ جھیلنے والی ایک عورت کی کہانی ہے، جس کے ذریعے ناول نگار نے معاشرے میں نسوانیت کی ایک اور بے بسی کو عیاں کیا ہے۔

مسز شاہ

یہ کردار بھی معاشرے کا ایک حقیقی کردار ہے جس نے مصلحت کا لبادہ اوڑھ کر وجودیت پرستی کو فروغ دیا ہے۔ مسز شاہ ایک ادھیڑ عمر خاتون ہے جس نے میرج بیورو بنائی ہے، میرج بیورو کی آڑ میں لڑکیوں سے جسم فروشی کروانا اِس کا کام ہے، ناول نگار نے اِس کردار کے ذریعے معاشرے کے اُس دوسرے رُخ کو نمایاں کیا ہے جو عام لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہتا ہے اِس کردار کے ذریعے وجودیت پرستی کو ایک نئے زاویے سے دکھایا گیا ہے۔

شکیلہ

ناول نگار کے نسوانی کردار اپنی اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہیں اور معاشرے کے حقیقی کردار ہیں وجودیت کس طرح اُن کرداروں کی شخصیت پر اپنا رنگ چڑھائے ہوئے ہے ناول کے نسوانی کرداروں سے اِس بات کی خوب وضاحت ہوتی ہے۔ شکیلہ کا کردار ایک ایسی بے بس عورت کا ہے جس کا خاوند تین بچوں کے بعد اسے چھوڑ گیا تھا وہ اکیلی رہنے پر مجبور ہے اور بچوں کو پالنے کیلئے جسم فروشی پر مجبور ہے، یہ معاشرے کی ایک تلخ حقیقت ہے جس سے ناول نگار نے فائدہ اٹھایا ہے اور بہت سارے سوالات کو جنم دیا ہے، کہ جس معاشرہ میں خود غرضی، ناانصافی اور حق تلفی جیسی بیماریوں مبتلا ہو جائیں وہاں وجودیت ایک نئے رُخ سے اپنا تعارف کرواتی ہے، اور معاشرے کا یہ رُخ انسانیت کے نام پر ایک سوالیہ نشان بن جاتا ہے، ناول نگار مختلف کرداروں کے ذریعے معاشرے کے چہرے کو بے نقاب کرتا ہے۔

انیس ناگی کا یہ الگ انداز تحریر ہے کہ وہ مسائل کا تعارف نہیں کرواتا بلکہ مسائل میں الجھے ہوئے کرداروں کا حال بتاتا ہے قاری اُن کرداروں کے احوال اور تصور وجود سے بات کی تہہ تک غوروخوض سے خود پہنچ جاتا ہے۔

روحی

یہ کردار پروین کی خالہ زاد بہن کی بیٹی کا کردار ہے، جو امجد کو جو کہ ایک ڈاکٹر ہے کو اپنے مصنوعی پیار کے جال میں پھنسا کر اُس سے شادی کر کے ایک پُر آسائش زندگی کی خواہاں ہے ناول میں جہاں نوجوان لڑکوں پر جائز وناجائز طریقہ سے زیادہ سے زیادہ دولت اور سہولتوں سے آراستہ زندگی کے خواہش مند ہیں، وہاں ناول کا یہ نسوانی کردار "روحی" بھی متوسط اور غریب طبقہ کی نوجوان لڑکیوں کی نفسیات کا عکاس ہے، جو پیار ومحبت کا ڈھونگ رچا کر حصول دولت اور پُر آسائش زندگی کی متلاشی ہے۔

ناول کے کچھ اور نسوانی کردار بھی ہیں جو اپنی جگہ معمولی نوعیت کے صحیح لیکن وجودیت کا تصور اُن کے ہاں بھی نظر آتا ہے جو افراد معاشرہ کی داخلی وخارجی سوچ کا ترجمان ہے۔

ناول کے نسوانی کرداروں میں، رعنا جس کے والدین امریکہ میں مقیم ہیں، ایک امیر خاندان سے تعلق رکھتی ہے، مریم جو پروین کی خالہ زاد بہن ہے جس کا خاوند بیرون ملک گیا واپس نہیں آیا اور مریم اپنی بیٹی کے ساتھ اکیلی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔

رابعہ

جو جمیل کی بیٹی ہے، پڑھی لکھی لڑکی ہے معمولی وضع قطع رکھنے کی وجہ سے ابھی تک کنواری ہے اور بیروز گار ہے، رابعہ کا کردار بھی ناول کا ایک قابل فہم کردار ہے جو افراد معاشرہ کی سوچ و فکر پر سوالیہ نشان ہے، کہ گزرتے وقت نے وجودیت کے گہرے اثرات نے معاشرہ کو کس طرح گھیرا ہوا ہے۔

مختصر یہ کہ انیس ناگی نے اپنے ہر کردار کے ذریعے وجودیت کے ایک نئے رنگ کو پیش کیا ہے اور معاشرے کے افراد پر اِس کے منفی اثرات کو واضح کیا ہے۔ موصوف کا یہ ناول اپنی طرز کا ایک منفرد ناول ہے ، مکمل خصوصیات کا حامل نہ ہونے کے باوجود بھی وجودیت کے حوالے سے ایک اہم ناول ہے جس میں حقیقت کہیں واضح نظر آتی ہے کہیں دُھندلی۔ موصوف نے ایک ماہر نفسیات کی طرح معاشرہ کے افراد کی سوچ و فکر، جذبات و احساسات کو احاطہ تحریر میں لا کر ایک اہم تصنیف کا اضافہ کیا ہے۔

حوالہ جات

1۔ انیس ناگی، پتلیاں، ص۲۸

2۔ ایضاً، ص۶۰

3۔ ایضاً، ص۱۷

4۔ ایضاً، ص۱۴۶

5۔ غلام حسین ساجد، مشمولہ سہ ماہی دانشور، انیس ناگی نمبر، مدیر عفت انیس، لاہور بک ہوم، ۲۰۱۱ء، ص۸۱

6۔ انیس ناگی، پتلیاں، ص۱۷۱

7۔ انیس ناگی، ایک ادھوری سرگزشت، لاہور، جمالیات، ۲۰۰۸ء، ص۱۰

8۔ ایضاً، ص۲۲۰

9.Kierkergaard,Soren "The Concept Of Dread"Trans:By Walter Lowrie "The Fabric of Existentialism Philosophical & Literary Sourees" P-167

10۔ انیس ناگی، پتلیاں، ص۲۲۴

11۔ ایضاً، ص۲۷۲

12۔ ایضاً، ص۷۶

13۔ ایضاً، ص۷۵

14۔ ایضاً، ص۹۰

15۔ ایضاً، ص۱۴۲

16۔ ایضاً، ص۱۶۱

17۔ ایضاً، ص۸

18۔ ایضاً، ص۴۵

19۔ ایضاً، ص۱۹۹

20۔ ایضاً، ص۱۹۷

21۔ ایضاً، ص۱۰۱

22۔ ایضاً، ص۴۴

23۔ ایضاً، ص۱۰۳

24۔ ایضاً، ص۱۸

25۔ سی۔اے قادر، ڈاکٹر، وجودیت ، مشمولہ ادب فلسفہ اور وجویت، لاہور: احسن نگارشات ۱۹۹۲ء، ص۱۵۷

26۔ انیس ناگی، پتلیاں، ص۲۸

27۔ ایضاً، ص۱۱۴

28۔ ایضاً، ص۱۱۵

29۔ ایضاً، ص۱۱۹

30۔ سارتر، ژاں پال، وجودیت اور انسان دوستی، مشمولہ: "نئی تنقید"، ص۲۶۹

31۔ انیس ناگی، پتلیاں، ص۲۸

32۔ غلام حسین ساجد، مشمولہ سہ ماہی دانشور، انیس ناگی نمبر، مدیر عفت انیسن، لاہور بک ہوم، ۲۰۱۱ء، ص۸۱

33۔ ایضاً، ص۱۵۶

34.karl Jaspers: “An introduction to his Philosophy”, P.112

35۔ سلام سندھیلوی، ڈاکٹر، اُردو ادب کا تنقیدی مطالعہ، میری لائبریری، لاہور، ۱۹۷۶ء، ص۶۶

باب چہارم

ناول "پتلیاں" کے کرداروں کا بیانیہ اور ان کے مکالموں کی ماہیت کا تنقیدی جائزہ

ا۔ مکالمے

مکالمہ نگاری پر بھی ناول کی کامیابی اور ناکامی کا بڑی حد تک دارومدار ہوتا ہے۔ناول کے کردار آپس میں بات چیت کرتے ہیں وہ بات چیت مکالمہ کہلاتی ہے اور ان کی بات چیت سے ہی اس بات کا پتا چلتا ہے کہ مکالمے کے ذریعے ناول نگار کس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔مکالمے کیلئے ضروری ہے کہ یہ طویل نہ ہو تاکہ پڑھنے والا اکتا نہ جائے۔اور جس کردار کی زبان سے ادا ہو رہا ہو اس سے مطابقت رکھتا ہو۔انیس ناگی نے اپنے ناول پتلیاں کو مختلف انداز کے ساتھ قارئین کیلئے نا صرف پُر اثر بنا دیا ہے بلکہ قاری ناول نگار کے پیغام تک بآسانی رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ناول نگار کا ہر مکالمہ معاشرے کی کسی نہ کسی حقیقت کو ظاہر کرتا ہے ۔ناول سے ایک مکالمہ دیکھئے:

"پروین"
پروین نے کوئی جواب نہ دیا کیونکہ وہ کسی اور فکر میں ڈوبی ہوئی تھی۔
اس نے پھر کہا۔۔۔
"پروین"
"ہاں" اس نے چونک کر کہا۔۔۔۔۔
جمیل جو عام طور پر کم گو تھا آج اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔
میرا خیال ہے پروین آدمی اپنے لئے بہت کم زندہ رہتا ہے دوسروں کا دباؤ
اسے ہر طرف دھکیلتا رہتا ہے۔[1]

ناول نگار نے مکالموں کے کرداروں کے ذریعے تصورِ وجود کو آسان اور عام فہم انداز میں بیان کیا ہے ۔کہ انسان دنیا میں اپنے لئے کم اور دوسروں کیلئے زیادہ جیتا ہے۔افراد کے درمیان زندگی گزارتے ہوئے اپنے آپ سے بیگانہ ہو کر مایوسیت اور گمنامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔وجودیت کا فلسفہ اصل میں تنہائی اور بیگانگی یا غیریت کا فلسفہ ہے۔اس حوالے سے ڈاکٹر سی۔اے۔قادر رقمطراز ہیں۔

"ہر وجود ایک مسئلہ ہے خود اپنے لئے اور دوسروں کے لیے ۔ مسئلہ تو دراصل جینے اور مرنے کا ہے۔ مرنا آسان ہے اور جینا مشکل، خاس طور پر ان خطوں میں جہاں زندگی ایک بارود خانہ ہو، جہاں ہر ذی نفس دوسرے کو فریب دینے کے لیے ہر وقت تیار ہو جہاں اضطراب میں رہنا ایک دائمی صورت حال ہو، اضطراب ظاہر ہے ۔ باطن میں ایک کیڑے کی طرح خاموشی سے لہو پیتا رہتا ہے۔ پھر ایک دن ایسا آتا ہے کہ آدمی اندر سے منہدم ہو جاتا ہے۔"(۲)

وجود ایک ایسی زبانی اور حکائی کیفیت ہے جو فرد کے ہونے یا اس کی ہستی پر فتح ہوتی ہے۔ وجود کی بنیاد عقل نہیں اور نہ ہی وجود تعقل پسند ہے۔ یہ تعقل کی بنیادوں پر قائم کسی بھی نظام کو تسلیم نہیں کرتا جس میں فرد اپنے جوہر کے حوالے سے اپنا اثبات تلاش کرتا ہے۔ اگر وجود کو عقل کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو انسان کو انسانیت سے کم تر سطح پر ثابت کرنا چاہتا ہے۔ فرد اپنی ہستی کے حوالے سے بسیط امکانات اور بے پناہ قوت تسخیر کا حامل ہے اس کی اہمیت افادیت اور کیفیات تفہیم سے ماورا ہیں۔ انیس ناگی نے اپنے ناول میں وجودیت کے حوالے سے انسانی نفسیات کو خوب پرکھا ہے ایک مکالمہ ملاحظہ ہو:

"جب اولاد منہ تک آجائے تو اس کے مقابلے کی بجائے پرہیز کرنا چاہیے۔"

"ہوں"

"کیا ہوں ہوں لگائی ہے۔"

"میرے لیے یہ اچھی خبر ہے وہ میری بے عزتی نہیں کرتا میں ہر انسانی نسل کا آدمی ہوں اور باہمی رشتوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ انسان احمق ہے جو اپنی تنہائی کو دور کرنے کیلئے رشتہ بناتا ہے اور پہلے سے بھی زیادہ تنہا ہو جاتا ہے۔" (۳)

موصوف نے ناول "پتلیاں" میں انسانی نفسیات کے نشیب و فراز کو وجودی تناظر میں اپنی تصنیف میں جگہ جگہ بکھیرا ہے معاشرہ اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں کس طرح وجودی تصورات کی ضد میں رہتا ہے اور یہ تصورات فرد کو کس طرح بے چین، گھٹن اور کرب کی کیفیت سے دوچار کرتے ہیں، ناول "پتلیاں" میں

جگہ جگہ دیکھا جا سکتا ہے۔ دنیا کی تمام اشیاء کی تعریف ان کی مخصوص خصوصیات کے حوالے سے کی جا سکتی ہے لیکن فرد کو خصوصیات کے حوالے سے پرکھنا ممکن نہیں۔ فرد تو اپنے آپ کو امکانات کے بحر ذخار میں دھکیل دیتا ہے اور امکانات کے حوالے سے زندگی کے نئے اور روشن افق تلاش کرنے کی سعی کرتا ہے ۔وجود امکانات سے نبرد آزما ہو کر اپنی فطرت یا جوہر کو خود طے کرتا ہے۔ تبھی تو سارتر نے کہا کہ:

"فرد کا وجود جوہر پر مقدم ہے اس سے ہماری مراد ہے کہ انسان پہلے وجود
میں آتا ہے اپنی ذات کا سامنا کرتا ہے کائنات میں ابھرتا ہے اور پھر کہیں
اپنے تصور کی تشکیل کرتا ہے۔اگر انسان کی جیسا کہ وجودیوں کا خیال ہے
پہلے تعریف ممکن نہیں تو یہ صرف اس لئے کہ انسان ابتداء سے کچھ نہیں ہوتا
وہ وہی کچھ ہوتا جو کچھ کہ اپنے آپ کو بناتا ہے۔"(۴)

وجودیت کی دوسری بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وجود ہر لحاظ سے یکتا اور لاثانی ہے اسکا مطلب ہے کہ فرد اپنے ہونے کے جواب سے کسی بھی دوسرے فرد سے مماثلت نہیں رکھتا۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ فرد معروضی دنیا کی بجائے ذاتی تجربے اور جذبے داروں پر یقین رکھتا ہے وہ اپنے رویے اور قدریں خود متعین کرتا ہے اور اس معاملے میں اسے کلی آزادی حاصل ہے۔ زندگی کے امکانات تو ہر لمحہ متبدل ہوتے ہیں اور ہر جگہ مختلف بھی لہذا ریوں، اقدار اور امکانات کی تلاش کی بنا پر ہر فرد دوسرے فرد سے منفرد اور یکتا ہوتا ہے۔ اسی حوالے سے ناول سے ایک مکالمہ پیش ہے:

" تنخواہ تو وہی چھ سات ہزار ہے وہاں سب لڑکے مار دھاڑ کی بات کرتے
ہیں کہ فلاں پوسٹنگ میں گئے مہینے میں اتنے پیسے باہر سے بن جاتے ہیں۔
سب کو ایک ہی بخار ہے۔"
"تم بھی یہ بخار جڑھالو۔"
"یہ آپ کہہ رہے ہیں آپ تو آئیڈلسٹ ہوا کرتے تھے"
"سب کچھ فراڈ نکلا تیسری دنیا میں آئیڈیلزم کمزوری کی نشانی ہے مار
دھاڑ کرو سب کا نصب العین یہی ہے۔"(۵)

وجودی فلسفہ کے نزدیک سچائی اور نیکی معروضی حقائق نہیں بلکہ موضوعی مسائل ہیں دوسرے لفظوں میں سچائی اور نیکی فرد کے داخل کا مسئلہ ہے خارج کا نہیں کیونکہ سچائی اور نیکی کا معیار فرد ہی ہے اور اسی

داخلیت کی روشنی میں فرد اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے نئے امکانات کی جدوجہد کرتا ہے تو وہ ایک خود بین اور خود آگاہ وجود کی صورت اختیار کرتا ہے جبکہ ہر وہ شے یا فرد جو امکانات کے حصول میں رکاوٹ بنے غیر مصدقہ وجود کی حیثیت رکھتا ہے۔ فرد کی خود آگہی بذات خود شاہد اور ایک منصف کا کردار ادا کرتی ہے۔ وہ خود مفاہیم اور اقدار کی خالق ٹھہرتی ہے یہی چیز فرد کیلئے باعث رخصت اور باعث سر بلندی اور سرشاری ہوتی ہے۔ وہ زندگی کو ایک نہج اور ایک نئے طور سے آشنائی کرانے کیلئے سو طرح جدوجہد کرتا ہے کبھی وہ انقلابی بنتا ہے کبھی باغی۔ کبھی سماجی کارکن، کبھی بھانڈ، کبھی اصلاح کل کا دعویدار اور کبھی لغویت کا علمدار۔ جوں جوں فرد کی خود آگہی بڑھتی وہ دنیا کو مسخر کرنا چاہتا ہے اس کے اندر ایک احساس ذمہ داری بڑھتا ہے، وہ تو نگر محسوس کرتا ہے تو دنیا اس کو ہیچ نظر آتی ہے اس پر واضح ہو تا جاتا ہے کہ دنیا کتنی معمولی ہے تب اس پر تنہائی اور مایوسی طاری ہو جاتی ہے۔ اسے اپنے جیسے خود آگاہ اور خود بین لوگوں کی تلاش ہوتی جس سے احساس تنہائی مٹ سکے۔ فرد کے ہاں جذبات و احساسات کا ایک سلسلہ ہوا کرتا ہے۔ جذبہ احساس کی اس دنیا کو فلسفہ کبھی بھی نظر انداز نہیں کر سکا۔ وجودیت نے فرد کی داخلی دنیا کو نہ صرف ایک نئے انداز میں دیکھا بلکہ فرد کے جذبے اور احساس کو بنیادی اہمیت کا حامل جانا۔ وجودی فلسفہ کے نزدیک فرد کی جذباتی کیفیات اور موضوعی مسائل ہی فرد کو اپنے وجود کا ادراک دیتے ہیں، اور یہی جذبی کیفیات اسے خود آگہی اور خود بینی سے آشنا کراتی ہیں۔ تاہم یہاں وجودی فلاسفر مختلف گروہوں میں بٹ جاتے ہیں، کچھ کے نزدیک دہشت، بوریت اور کراہیت بنیادی جذبی کیفیات ہیں، جبکہ کچھ کے نزدیک اُمید، خوشی اور وابستگی کے جذبات زیادہ اہم ہیں۔ اسی طرح وجودی فلسفہ کے نزدیک مایوسی، خمیر بد اور جرم کی کیفیات بھی اہم ہیں۔ وجودی فلاسفر ان کیفیات کو محض نفسیاتی کیفیات ماننے سے منکر ہیں، ان کے نزدیک یہ وجودی وارداتیں ہیں کیونکہ نفسیاتی کیفیات کی سائنس توجیہہ ممکن ہے جبکہ وجودی حوالے سے اِن کیفیات کی توجیہہ ممکن نہیں۔ انیس ناگی افراد کی نفسیات کی مختلف پرتوں کو وجودی حوالے سے کھولا ہے، جس سے معاشرے کی متضاد صورتحال سامنے آتی ہے۔ ناول نگار نے ہمارے معاشرے کے افراد کو اور اِن کی سوچ کو وجودی تصورات کے ساتھ مکالماتی انداز میں یوں پیش کیا ہے:

"تم لوگ پاگل ہو، بہن چود ایم ڈیThis is road of authority"

ایم ڈی کی رٹ لگا رہے ہو،

"یار کتنے پیسے پوڑ لیتے ہو،

"جتنے چاہوں، جس کو چاہوں ریپ کر سکتا ہوں اور ڈاکٹر احمد کو ملزم بنا سکتا ہوں۔"

"لیکن تم انسپکٹر کیسے بن گئے ہو؟"

"اخبار میں اشتہار آیا تھا ایک جعلی سا امتحان دیا میرا ایک کزن ممبر ہے باقی کام اس نے دکھایا۔"

"ویل ڈن" انور نے اچھل کر کہا۔(۶)

وجودیت پسندوں کے نزدیک فرد کبھی بھی اپنے حالات پر قانع نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ بہتر سے بہتر کی تلاش میں اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔ اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ آزادی کی اساس عمل ہے اور آزادی کا تصور وجودیت کے بنیادی تصورات میں سے ایک ہے تقریباً سبھی وجودی فلاسفر کے ہاں آزادی کا تصور موجود ہے یہ تصور کرکیگارڈ کے ہاں بھی اتنا ہی موجود ہے جتنا سارتر اور کامیو کے ہاں۔ یہ الگ بات ہے کہ سارتر اور کامیو کے ہاں وجود اور آزادی لازم و ملزوم ہیں یہ ممکن نہیں کہ وجود پہلے ہو اور آزادی بعد میں، یوں کہہ لیجئے کہ وجودی فلاسفر کے نزدیک آزادی کوئی معروضی چیز نہیں ہے بلکہ یہ ایک موضوعی مسئلہ ہے، داخل کا مسئلہ، ایک عرفانی کیفیت ہے، جسے ثابت کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ یہ عمل کے ساتھ متصل و متحد ہے اور وجود اس آزادی سے مشروط ہے کیونکہ مصدقہ وجود وہی ہے جسے آزادی حاصل ہے۔

جان میکوری کے مطابق:

> "علم حقیقت الاشیا کا نظام تسلیم کرتا ہے کہ ہستی کی مطلق اولیت جبری ہے ہر معروضی نظام فہم جبر کا مسئلہ ہے یہ آزادی کو ہستی سے ماخوذ کرتا ہے ظاہر ہے کہ آزادی کو ہستی ہی معین کرتی ہے، جس کا مطلب ہے کہ ضرورت آزادی کو جنم دیتی ہے ہستی ایک مثالی ضرورت ہے۔ ان کا جُدا ہونا ممکن نہیں یہ مہک مکمل اور مطلق وحدت ہے لیکن آزادی کبھی بھی ہستی سے ماخوذ نہیں ہوتی۔ اصطلاح میں بات کریں تو اس کی جڑیں لاشئیت Ontology میں پیوست ہے۔(Non being) اور غیر ہستی (Nothingness) آزادی بے بنیاد ہے۔ ہستی نہ اسے جنم دے سکتی ہے اور نہ ہی معین کر سکتی ہے۔"(۷)

آزادی کا منبع محض ہستی نہیں ہے ضرورت آزادی اور وجود باہم متحد و متصل ہیں۔ اور ہر ایک دوسرے کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ وجود کو آزادی کے بغیر وجود نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ آزادی

وجود کیلئے ناگزیر ہے وجود آزادی کے بغیر ناممکن ہے۔ آزادی ہی وجود کو دنیا اور مستقبل کے ساتھ نبرد آزما ہونے کا حوصلہ دیتی ہے ناول کے کرداروں کا مطالعہ کرنے پر قاری اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ وجودیت کا لبادہ اوڑھے ہوئے تمام کردار اپنی موجودہ صورت حال سے آزاد ہونے کیلئے کبھی حالات، کبھی اپنے آپ سے نبرد آزما ہیں۔ ناول سے ایک مطالعہ پیش خدمت ہے:

"تم نہیں جانتی کہ زندگی کو کامیاب بنانے کیلئے جذبات کے سیال کو باہر نکال دیناچاہیے۔"

"جمیل صاحب! آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں جذبات کے بغیر ایک پتلی بن کر رہوں۔" انسان خود ایک جذبہ ہی تو ہے۔"

"اچھا تم نے کہا تھا کہ ہر انسان ایک کہانی ہے لیکن یہ کیا پھیکی ہے اس میں جبر ہے۔"(۸)

آزادی وجود کیلئے ناگزیر اور وجود آزادی کے بغیر نامکمل ہے اور آزادی ہی وجود کو دنیا اور مستقبل کے ساتھ نبرد آزما ہونے کا حوصلہ دیتی ہے اس ساری بحث کا مطلب یہ ہے کہ وجود آزاد ہے۔ یہ آزادی سوچ، فکر و شعور سے لیکر سماجی اور معاشرتی اقدار اور زندگی کے نصب العین تک محیط ہے۔ زندگی کے مقاصد اور اقدار ہر فرد خود متعین کرتا ہے۔

ب۔ خود کلامی

بُرے خیالات سے نجات حاصل کرنے کا بہترین طریقہ خود کلامی ہے، خود کلامی تنہائی کے احساس کو کم کرتی ہے ہمیں اکثر لوگ ایسے دیکھنے کو ملتے ہیں جو خود کلامی میں مصروف ہوتے ہیں، انہیں اپنے ارد گرد کسی کی پرواہ نہیں ہوتی کہ کون سن رہاہے اور کیا سوچے گا یا کہے گا وہ مسائل یا حالات سے جنگ کر رہے ہوتے ہیں اور انہیں خود محسوس نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ ایک خواب کی سی کیفیت میں ہوتے ہیں، ماہرین کا کہنا ہے کہ خود کلامی پاگل پن نہیں بلکہ ذہن اور یادداشت کی ٹریننگ میں مثبت کردار ادا کرتی ہے، خاص طور پر عمر رسیدہ افراد کو باقاعدگی سے خود کلامی کرنا چاہیے، تاکہ دیگر افراد کو اپنی طرف متوجہ کر سکیں۔ انیس ناگی نے اپنے ناول "پتلیاں" کو مختلف رنگوں سے مزین کرتے ہوئے وجودی تصورات کو پر کھا ہے۔

خود کلامی بھی ناول کے کرداروں کے مسائل کو سامنے رکھنے کیلئے ایک مؤثر طریقہ اظہار ہے جس کی مدد سے ناول نگار نے افراد معاشرہ کی اندرونی کشمکش کو واضح کیا ہے۔ ناول سے اقتباس پیش ہے:

"امجد کے ذہن میں ایک طوفان برپا تھا، وہ کار میں سوار شبنم کو ملنے کیلئے جارہا تھا، اِس نے نہر کے کنارے کار روک کر کچھ دیر کیلئے نہر کے کنارے ٹہلتا ٹہلتا یہ سوچ رہا تھا کہ وہ شبنم کو کیوں ملنے جارہا ہے۔ وہ اسے کیا دے سکتی ہے۔ ہر عورت اپنا بدن زیر کرنے کی قیمت مانگتی ہے، پیشہ ور عورتیں ایک مشت مانگتی ہیں اور دوسری شادی اور حق مہر کی شرط منواتی ہیں، انسان اندر سے کتنا گھناؤنا ہے۔"(۹)

ناول نگاری کے اصول و ضوابط کے حوالے سے دیکھا جائے تو انیس ناگی کے ناول "پتلیاں" میں ذریعہ کے اظہار کے مختلف طریقے ناول کی ایک خوبی ہے جو قاری کے سفر کو رُکنے نہیں دیتی۔ پڑھنے والے کے ذوق کی تسکین کیلئے ناول نگار کے مختلف طریقہ ہائے تحریر پُر اثر ہیں، افراد کے اندرونی جذبات کی ترجمانی کیلئے خود کلامی ایک مؤثر طریقہ اظہار ہے، جو ناول نگار نے برتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

"ہر آدمی ایک ڈوپلیکیٹ زندگی بسر کرتا ہے، وہ ہمیشہ ایک پوز میں رہتا ہے، اِسکا اظہار ہر حلیہ اِس کی ذات کو سمجھنے کی ایک علامت ہوتی ہے، کیا بکواس کر رہے ہو؟ جمیل نے اپنے آپ سے کہا اور ہاتھ مار کر رائٹنگ پیڈ پرے دھکیل دیا۔"(۱۰)

انیس ناگی انسانی نفسیات کی الجھنوں کو کرداروں کی گفتگو اور خود کلامی سے ظاہر کرتے ہیں اور اِس کے ساتھ الفاظ عام فہم استعمال کر کے نہ صرف مختلف مسائل اور الجھنوں کو نمایاں کر دیتا ہے بلکہ قاری کو اُس سے آگے سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ موصوف نے کرداروں کے ذریعے جن جن وجودی تصورات کا احاطہ کیا ہے پڑھنے والا اُن تصورات کو اپنے ارد گرد اور اپنی ذات کے اندر بھی محسوس کرتا ہے۔ اقتباس دیکھئے:

"جمیل آپ مجھے چوری چھپے کیوں دیکھ رہے ہیں اگر کسی نے آپ کو اور مجھے دیکھ لیا تو طوفان آجائے گا، راحت نے پیچھے مڑ کر دیکھا وہاں کوئی نہیں تھا اِس نے پھر آئینے میں جھانکا تو اسے یوں لگا کہ جمیل آئینے میں سے جا چکا تھا لیکن جاتے وقت اپنے عکس کا دھبہ چھوڑ گیا تھا۔ آجائیں جمیل واپس آجائیں، میں آج آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں، مجھے شرم بھی آتی ہے لیکن اب شرم سے کوئی فائدہ نہیں، آپ ٹھیک کہتے تھے میں وہ نہیں ہوں جو کچھ ہوں

،حالات کی مجبوری تھیکہ میں آپ کو چھوڑ دوں لیکن میں چھوڑ نہیں سکتی تھی،
آپ کی نگاہوں کی شفقت اور محبت نے مجھے گھائل کر دیا تھا، میں جان بوجھ
کر آپ کو روکتی تھی کہ کہیں آپ کوئی ایسا فیصلہ نہ کر بیٹھیں جو آپ کی تباہی
کا باعث ہو، میں تو پہلے ہی تباہ ہو چکی تھی۔"[11]

انیس ناگی مختلف خیالات کو مناسب کرداروں اور مناسب طریقہ اظہار کے ذریعے سے اپنی تحریر کا حصہ بناتے ہیں، وہ بات چیت کے مختلف انداز اپناتے ہوئے معاشرہ کی اندرونی اور بیرونی دنیا کو بے نقاب کرتے ہیں۔ خود کلامی کے ذریعے وہ افراد معاشرہ کی اندرونی کشمکش کو بیان کرتے ہیں، اور خود کلامی کے ذریعے ایسے خیالات کو پیش کرتے ہیں، جو خود کلامی کا لازمی جزو سمجھتے ہیں۔ راحت ناول میں اپنے آپ سے ہم کلام ہو کر کہتی ہے۔ میں اب شاید آپ کو پھر کبھی نہ مل سکوں، آپ ٹھیک کہتے تھے کہ کوئی رشتہ ازلی نہیں ہوتا، یہ صرف انسانی یادداشت کے مسئلے ہیں، میں نے آپکی نصیحت پر عمل کیا ہے، میں نے اپنی بیٹیوں کو دنیا کے حوالے کر دیا ہے، دیکھیں دنیا اِن کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے، جو میرے ساتھ سلوک کیا گیا آپ نے بھی دیکھ لیا میں جھوٹ نہیں بول رہی ہوں، میں نے ایک جھوٹ ضرور بولا کہ نسیم سے میرا تعلق نہیں ہے، میرا دور کا رشتہ ضرور ہے، یوں تو سارے انسان ایک دوسرے کے رشتہ دار ہیں کیونکہ سب آدم کی اولاد ہیں، اِس نے میرے خاوند سے جھگڑے کا فائدہ اٹھایا، اِس نے عدالتوں میں میری مدد کی، میرے وہ اخراجات اٹھائے جو میں پورے نہیں کر سکتی تھی، میری ماں سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی نہ دیکھنے کا بہانہ کرتی تھی، اسے معلوم تھا جمیل آپ کے بارے میں۔۔۔۔۔۔۔وہ میرے اتنا قریب آچکا تھا کہ میرے لئے پیچھے ہٹنا ممکن نہیں تھا مجھے اس کا نتیجہ معلوم تھا، وہ میرے ہر معاملے میں مداخلت کرنے لگا میں اپنی جھنجلاہٹ کو ظاہر نہ کرتی کہ میں ضرورت مند تھی، سیکس تو اسکے ساتھ ممکن ہے جس سے دِل ملتا ہو۔ اوہ معاف کرنا جمیل صاحب میں بکواس کرنے لگی ہوں۔ آپ بُرا نہ مانیں، اندر آ جائیں، آپ دروازے کے ساتھ کیوں کھڑے ہیں، اب یہاں کسی نے نہیں آنا، راحت لڑکھڑاتی ہوئی اُٹھی۔۔۔۔۔۔یہ کیا بکواس ہے، یہ کہہ کر اِس نے میز پر رکھی ہوئی گولیاں ایک ایک کر کے اٹھائیں، انہیں سر کے ایک جھٹکے سے نگل لیا، پانی کا گلاس اِس کے ہاتھ سے گر کر فرش پر چکنا چور ہو گیا۔

انیس ناگی ایک ماہر سراغ رساں کی طرح افراد معاشرہ کے درمیان شہر کی گلیوں، بازاروں، گھروں کے ماحول افراد خانہ کی عمر کے مطابق جذبات واحساسات، افراد معاشرہ کے مختلف رویوں اور اِن کی وجہ بننے

والے حالات اور حالات کے بھنور میں پھنسے لوگوں کی بے چینی اور کرب، زندگی کی الجھنوں، رشتوں اور حالات کے ظلم و ستم کو خوب آسان اور عام فہم الفاظ میں بیان کرنے کا ہنر رکھتے ہیں۔ وہ حالیہ تصویر کشی کر کے جو مناظر تراشتے ہیں، اُس کو صحیح تناسب میں رکھتے ہوئے زندگی کی تعریف کرتے ہیں۔ انیس ناگی نے بڑی چابک دستی سے اس عہد کی تصویر اپنے ناول "پُتلیاں" میں پیش کی ہے جہاں تیسری دنیا ایک المیہ ہے جہاں فرد کی شخصی آزادی، جنسی آزادی، ایک التباس ہے ناول میں جس طبقے کی عکاسی کی گئی ہے اس حوالے سے بشریٰ نقوی لکھتی ہیں:

"It is lucid depiction of middle class and his values and ethics.It especially describes the frustrations of this class.The youth,including Amjad,suffer the anxiety of unemployment,and an acute sense of helpless.corruption and Nepotism are rampant and strike severely this particularly class"(۱۲)

ناول کے کچھ کردار تو حالات کے بھنور میں پھنسے بے حس و حرکت دکھائی دیتے ہیں۔ وہ حرکت کرنے کی استطاعت رکھنے کے باوجود اپنے آپ کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑنے پر مجبور ہیں۔ ناول کے نسوانی کردار کی ذہنی کشمکش کو انیس نے مؤثر انداز میں بیان کیا ہے جو حالات کی کشیدگی کا شکار ہو کر ایک دوراہے پر کھڑی ہے اُس کے ماضی کی کسک اُسے مایوسی اور نااُمیدی کے گرداب میں ڈالے ہوئے ہے۔ اقتباس دیکھیے:

"یہ بلب تو اسی طرح جلتے رہیں گے ان کو بجھائیں تو بجھ جائیں گے، موم بتی تو اپنے جسم کی قربانی دیتی ہے، وہ رات کو صبح تک پہنچانے کیلئے خود گُھل جاتی ہے، میں کس کیلئے قربانی دے رہی ہوں، وہ حرام زادہ نسیم کہتا ہے ابارشن۔۔ڈیم اٹ۔۔ پھر کہتا ہے کہ یہ سب جمیل کی وجہ سے ہوا ہے۔ میں ایک ٹیچر ہوں، میری بہت سی شاگردیں ہیں، Do you know بہت سے لوگ مجھے جانتے ہیں، کیا کہیں گے میں نے اِس عمر میں DNS چھوڑو یار کن باتوں میں لگ گئی ہو، میرا سانس گھٹ رہا ہے۔ میں انجم کو ٹیلیفون کر کے کچھ باتیں بتا دیتی ہوں، کہ اِس نے کیا کچھ کرنا ہے۔۔۔۔، یہ

کہہ کر راحت گری پڑی ٹیلیفون تک پہنچی، اور بڑی مشکل سے ڈائل پر نمبر تلاش کر کے ڈائل گھمانے لگی۔"(۱۳)

ناول نگار نے ناول "پتلیاں" میں کہیں کہیں واضح الفاظ میں زندگی کی تلخیوں اور سفاکیوں کو کرداروں کی زبانی پڑھنے والے کے گوش گزار کیا ہے، افراد کے دِل و دماغ پر وجودی تاثرات کی وجہ سے زندگی میں جو گھبراہٹ اور بے چینی آئی ہے وہ اِس ناول کا موضوع ہے۔

زندگی کی تلخیوں اور محرومیوں کو ناول نگار نے مختلف کرداروں کے ذریعے حقیقی روپ میں پیش کر دیا ہے۔ناول کا مرکزی کردار جمیل اپنی زندگی کی محرومیوں اور افراد خانہ کے رویوں سے جن تصورات کا شکار ہو کر مایوسی اور نااُمیدی کے جال میں پھنسا ہوا ہے، اِس کا اطلاق معاشرے کی مجموعی خاندانی زندگی پر واضح دکھائی دیتا ہے۔ کردار جمیل کی خود کلامی کا نمونہ دیکھئے:

"میں اب نئی زندگی شروع نہیں کروں گا، بلکہ پچھلی زندگی کے نقوش کو مٹاتا جاؤں گا تاکہ میرا کوئی نشان نہ رہے، کوئی یہ بھی نہ جان سکے کہ میں زندگی کے روپ میں اِس دنیا میں آیا تھا، میرے معاملات اب طے ہو چکے ہیں، نشاط نے بہت کچھ چھوڑا ہے یہ تو ہے کمینگی کہ میں اِن املاک سے فائدہ اٹھاؤں جو میری نہیں ہیں اور لاچاری کی حالت میں مجھے ملے ہیں، میں نے اِن کا کیا کرنا ہے، جیتے جی کون کسی کو کچھ دیتا ہے، امجد ملازمت پر آ گیا ہے، انہیں میرا موروثی گھر مل گیا ہے، نشاط کا روپیہ پیسہ بھی اِنہیں مل جائے گا، میں اب فارغ ہوں، جہاں چاہوں گا چلا جاؤں گا، اب میں کسی کیلئے ذمہ دار نہیں ہوں میں آزاد ہوں مگر ایسی آزادی کا کیا کروں گا جب میں ہر ایک بات، ہر ایک چیز سے دست بردار ہو رہا ہوں اور زندگی کو معنی دینے سے منحرف ہوں۔"(۱۴)

انیس ناگی نے کرداروں کی نفسیات اور اندرونی کشمکش سے افراد معاشرہ کی زندگی کی الجھنوں اور بے زاری کو فلسفیانہ انداز سے صفحہ پر منتقل کیا ہے، وجود کا رنگ اور ناول نگاروں کے ہاں بھی دکھائی دیتا ہے لیکن انیس کے ناول اِس رنگ پر ہیں۔

ج۔ توضیحی بیانیے

ادب میں بات چیت کو رمز وایما کے ساتھ بیان کر دینا عبارت کا حسن بھی ہے اور اصول تحریر بھی۔ لیکن کچھ ناول نگاروں کے ہاں سیدھا اور سپاٹ انداز بھی پایا جاتا ہے، وہ کسی بھی بات کی وضاحت صاف اور سیدھے انداز میں کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے، سعادت حسن منٹو کی تحریروں کو اگر دیکھا جائے تو انھوں نے اُن باتوں کو بھی واضح الفاظ میں ہمارے سامنے رکھا ہے جن کو دوسرے ناول نگار اپنی تحریروں کا حصہ بنانے سے گریز کرتے ہیں۔ انیس کے ہاں بھی منٹو کا انداز بیان پایا جاتا ہے، ناول "پتلیاں" میں موصوف نے معاشرے کے کئی پہلوؤں کو صاف اور واضح انداز میں پیش کیا ہے، اور نہ صرف پیش کیا ہے بلکہ وضاحت کے ساتھ داخل تحریر کیا ہے۔

ناول نگار معاشرے کے اُن پوشیدہ وجودی تصورات کو بھی عیاں کرتے ہیں، جن پر بات کرنا اِس معاشرے میں معیوب سمجھا جاتا ہے، وجودیت پرست معاشرے کی چھپی ہوئی تصویر کو وہ کس طرح سامنے لاتے ہیں، آیئے دیکھتے ہیں:

> "شام کو عورتیں ڈرائیونگ سکولوں کی کاروں میں ڈرائیونگ سیکھ رہی ہوتی ہیں، جب رات گہری ہو جاتی ہے تو اِن کواٹروں سے لڑکیاں بن سنور کر نکلتی ہیں اور آبادی کی سڑک پر منتظر کار میں جلدی سے گھس جاتی ہیں، اِس شہر میں ہر کام چوری چھپے ہوتا ہے کیونکہ خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا۔ اِس شہر میں رات پچاس کے قریب چکلوں میں عورتوں کا کاروبار چلتا رہتا ہے لیکن اگر کسی جوڑے کو کوئی وردی پوش دیکھ لے تو پھر نکاح نامہ پیش کرنا ضروری ہو جاتا ہے وگرنہ حوالات کی سیر یقینی ہو جاتی ہے، اگر میاں بیوی بزدل ہوں تو حوالات میں پہنچنے سے پہلے ہی رہا ہو جاتے ہیں، یہ اِس شہر کا چلن ہے۔ لوگ کبھی کبھار بڑبڑ کرتے ہیں اور بس۔"(۱۵)

انسانی زندگی ناگہانی حادثات اور موقع کا مرقع ہوا کرتی ہے، اور یہ تمام حادثات اور مواقع قطعی انفرادی ہوتے ہیں فرد اِن حادثات اور واقعات سے خود اپنی ذات کی سطح پر نبرد آزما رہتا ہے اور یوں وہ اپنی اندرونی کیفیات اور جذبے کے حوالے سے اپنی مرضی اور اپنی پسند کا اظہار کرتا ہے، یعنی وجود کی ماہیت پہلے

سے طے شدہ نہیں، اِس لئے وہ خود اپنی ماہیت طے کرتا ہے اور یہی اِس کی آزادی ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی کے بقول:

> "ہر فلسفے کی طرح وجودیت کا بھی یہی مقصد ہے کہ وہ انسان کو سوچنے پر مجبور کرے، انہیں غور و فکر کا عادی بنائے تا کہ وہ عمل کی طرف رجوع کر سکیں اور اِس طرح عرض خاکی پر آگر وشن رکھی جاسکے، اِس فلسفے کا سارا زور اِس بات پر ہے کہ انسان کی ذات سے بالا کوئی دوسری ذات نہیں ہے، میں ہی خود اپنا گلستان ، میں ہی خود اپنا قفس، ذات کا عرفان ہی اس کے وجود کو قائم کرنے کا ذریعہ ہے۔"(۱۶)

وجودیت پسندی انسانی وجود کے بارے میں ایک حقیقت پسندانہ سوچ ہے، وجود اپنے آپ کو مستقبل میں تسلیم کرانے کا نام ہے، اور اِس جدوجہد میں تمام تخیل و تصور اور منصوبہ سازی شامل ہے۔ لیکن وجود کی منصوبہ سازی، تخیل و تصور، امکان کے انتخاب، مستقبل بینی اور لمحہ موجود کی حقیقی صورت حال کے درمیان ہمیشہ ایک عدم توازن بھی دیکھنے میں آتا ہے۔شاید وجود کا ہی ادھوراپن ہے اور اِس کی تکمیل کیلئے وجود وقت سے نبرد آزمار ہتاہے۔وجودیت کے کئی پہلو ہیں، ایک پہلو یہ ہے کہ وجودیت ہی معاشرے میں بگاڑ کا سبب بنتی ہے، قدروں کی پامالی، غربت افلاس، استحصال یہ سب وجودیت ہی کی پیداور ہیں۔

ناول کے کرداروں کے درمیان وجودی کشمکش ہے، جو آزادی کی دلیل ہے، وہ اپنی موجودہ حالت سے آزادی چاہتے ہیں ، آزادی وجود کیلئے ناگزیر ہے وجود آزادی کے بغیر نامکمل ہے آزادی ہی وجود کو دنیا اور مستقبل کے ساتھ نبرد آزما ہونے کا حوصلہ دیتی ہے، اِس ساری بحث کا مطلب یہ ہے کہ وجود آزاد ہے یہ آزادی سوچ و فکر شعور سے لیکر سماجی و معاشرتی اقدار اور زندگی کے نصب العین تک محیط ہے۔ زندگی کے مقاصد اور اقدار ہر فرد خود متعین کرتا ہے۔

جوں جوں فرد کی خود آگہی بڑھتی ہے وہ دنیا کو مسخر کرنا چاہتا ہے، اس کے اندر ایک احساس ذمہ داری بڑھتی ہے وہ دولت مند محسوس کرتا ہے تو دنیا اس کو ہیچ نظر آتی ہے۔اِس پر واضح ہو تا جاتا ہے کہ دنیا کتنی معمولی ہے ، اسکے واقعات کتنے ہنگامی ہیں اور یہ سب کچھ کس قدر لغو ہے ، تب اِس پر تنہائی اور مایوسی طاری ہو جاتی ہے۔ناول کے کرداروں کے ذریعے ناول نگار افراد معاشرہ اور زندگی کی حقیقتوں سے پردہ اٹھاتا ہے اور کہتا ہے کہ:

"یہ دنیاخود غرضی کی دنیاہے، ہم زندہ رہنے کیلئے ایک دوسرے کو سہتے ہیں، بظاہر خون کے رشتوں کی آڑ میں جینے کا بہانہ کرتے ہیں انسان جو چاہتا ہے نہیں کر سکتا یہی اِس کا المیہ ہے۔"(۱۷)

انیس ناگی معاشرے کے اُن تضادات کو تلاش کر کے منظر عام پر لاتا ہے جو پوشیدہ رہ کر بھی محو سفر رہتے ہیں، وجودیت کے وہ رُخ جو معلوم ہونے کے ساتھ پس پردہ رہتے ہیں۔ موصوف اُن کو سامنے لا کر معاشرے اور افراد کے دورُخے پن کی وضاحت کچھ یوں کرتا ہے:

"ہم یہ سمجھتے ہیں کہ عورت اور آدمی جنسی تعلق کے بغیر ایک دوسرے کو مل نہیں سکتے، کہتے ہیں شرم و حیا ہمارا کلچر ہے، بہت خوب، اگر یہ کلچر ہے تو شہر میں ایک لاکھ کے قریب کال گرلز کہاں سے آ گئیں؟ ہر کوئی اپنی طرف دیکھنے کی بجائے دوسرے کی طرف دیکھتا کہ وہ کیا کرتا ہے، تاہم سب اخلاقی طور پر چور ہیں۔"(۱۸)

انیس ناگی وجودیت کے حوالے سے انسانی نفسیات کو پرکھتا ہے اور اس کو اپنے عام فہم الفاظ میں تفہیم کے قابل بناتا ہے زندگی کن پُر رنگوں سے عبارت ہے اور اِس کے نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے فرد کی ذات کے تاثرات کیا ہوتے ہیں۔ معاشرے کے رسم و رواج اور افراد معاشرہ کے درمیان ہونے والے سمجھوتے اور اختلافات کو واضح الفاظ میں یوں ہمارے سامنے رکھتے ہیں:

"مستقبل تو ایک ابہام ہوتا ہے ایک فیصلہ ہوتا ہے،ایک خوشگوار گرہستی؟ انسان ایک دوسرے کیلئے اجنبی رہتا ہے، یہ زندہ رہنے کیلئے عارضی سمجھوتے ہیں؟ جنہیں ہم محبت، خون کے رشتے نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں، سمجھوتہ ہمیشہ مجبوری کا نتیجہ ہوتا ہے یہ زندگی میرے لئے کافی نہیں ہے۔"(۱۹)

ناول نگار نے معاشرتی زندگی اور افراد کے مابین ہونے والی کشمکش معاشرتی ناہمواریوں، متضاد انسانی رویوں، اور دیگر امور کو ہلکے تاثرات دے کر اور کِس وضاحت کے ساتھ داخل تحریر کیا ہے۔ ایک ماہر پارکھ کی طرح وجودیت کی اثر پذیری کو افراد معاشرہ کی نفسیات پر نمایاں کر کے دکھایا، کہیں پر معاشرتی تضادات اور

وجودیت کے اثرات سے پیدا ہونے والے مسائل اور الجھنوں کو نمایاں کیا ہے۔ معاشرتی سیاسی نظام اور اِس کی ناہمواریوں کی وضاحت کچھ یوں کرتے ہیں:

"لوگوں اور سیاست دانوں کا خیال ہے کہ ملک اِن افسروں کی سہولتوں کیلئے بنایا گیا ہے، نئے ورلڈ آرڈر میں اِن کی موجودگی ضروری نہیں ہے، یہ ایک بہت بڑا سیاسی مغالطہٗ تھا نظام حکومت کو چلانے کیلئے اِن کی موجودگیضروری ہے البتہ ان کے اختیارات کو محدود کرنا چاہیے، لوگ اور سیاستدانبے علم ہیں، یہ طبقہ ایک طرح کا اژدھا ہے جو دھیرے دھیرے کروٹ لیتاہوا ہر سوار کو نیچے گرا کر اسے دونوں طرفوں سے کھاتا ہے۔"(۲۰)

انیس ناگی نے زندگی کی پرتوں کو دیکھتے ہوئے اس کے ساتھ جڑے افراد کے تصوارت کو پرکھا اور اُن تصورات کے پیچھے کیا کیا عمل کار فرما ہیں، اُن پر روشنی ڈالتے ہوئے اُن کے مثبت اثرات کی طرف توجہ دلائی ہے۔

ایک ماہر نبض شناس کی طرح انیس ناگی نے بھی افراد معاشرہ اور اِن کے ماحول کے درمیان پائی جانے والی کشمکش اور کٹھن کو نمایاں کیا ہے، مختصر یہ کہ ناول "پتلیاں" میں وجود اور وجودیت نمایاں اور کار فرماں نظر آتی ہے، اور ناول نگار نے اِس کی اثر پذیری سے معاشرے کا کھوکھلا پن ہمارے سامنے رکھا ہے۔ یہ ناول ایک مکمل وجودی تاثر لئے ہوئے ہے۔ ناول نگار نے نہ صرف معاشرے بلکہ گھر کی دہلیز کے اندر وجودیت کی اثر پذیری کے نمایاں نقوش کی وضاحت کی ہے۔

حوالہ جات

1۔ انیس ناگی، پتلیاں، ص ۱۴۵

2۔ سی اے قادر، وجودیت، شمولہ، "ادب فلسفہ اور وجودیت" مرتبہ شیما مجید، نعیم الحسن، نگارشات، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۸۲۷

3۔ انیس ناگی، پتلیاں، ص ۲۴۵

4۔ میری وارناک، وجودیت اور سارتر، مشمولہ، "ادب فلسفہ اور وجودیت"، مرتبہ شیما مجید، نعیم الحسن ،نگارشات لاہور ۱۹۹۲ء، ص ۶۸۷

5۔ انیس ناگی، پتلیاں، ص ۲۶۳

6۔ ایضاً، س ۲۹۲

7.”Macquarrie,John” "Existentialism" Penguin Books Great Britaim, 1980 page 179

8۔ انیس ناگی، پتلیاں، ص ۱۳۶

9۔ ایضاً، س ۴۶

10۔ ایضاً، س ۱۸۶

11۔ ایضاً، س ۲۶۸

12۔ بشریٰ نقوی، مشمولہ دانشور، مدیر: عفت انیس، (لاہور: جمالیات، شمارہ ۳۳، جنوری تا مارچ ۲۰۰۲)، ص: ۸۷

13۔ ایضاً، س ۲۷۰

14۔ ایضاً، س ۲۷۲

15۔ ایضاً، س ۳۳

16۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تنقید و تجربہ، یونیورسل بک لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۳۲۴، ۳۲۱

17۔ انیس ناگی، پتلیاں، ص ۳۴

18۔ ایضاً، س ۱۴۲

19۔ ایضاً، ص۱۵۸

20۔ ایضاً، ص۱۷۶

ماحصل

مجموعی جائزہ

انیس ناگی کا شمار جدید اردو ادب کے اہل دانش میں ہوتا ہے۔ان کی تخلیقی زندگی کا سفر ساٹھ کی دہائی سے ہوا اور وہ تادمِ مرگ اکتوبر ۲۰۱۰ تک قلم اور کتاب سے وابستہ رہے۔انیس ناگی نے روایتوں سے بغاوت کا علم بلند کیا،وسعت مطالعہ،وجودی نظریات،روایت سے بغاوت ان کی پہچان کا بنیادی اور پہلا حوالہ ہیں۔انہیں اردو ادب کا اینٹی ہیرو بھی کہا جاتا ہے ان کی شخصیت اور فن پر فرانز کافکا،سارتر،دوستو ئفیسکی اور بالخصوص کامیو کے وجودی فلسفہ کے اثرات پائے جاتے ہیں ۔ان کے ناول اور شاعری پر وجودیت کی گہری چھاپ ہے۔انہوں نے اپنے ناولوں میں وجودیت کی روایت کو برقرار رکھا ان کے ناولوں میں وجودی رجحانات، سماجی شعوراور تاریخی عناصر کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ان کے وجودی ناولوں پر بالخصوص کامیو اور سارتر کے اثرات بہت واضح ہیں ۔جن ناولوں میں وجودی اثرات پائے جاتے ہیں ان میں سے ایک ناول "پُتلیاں" ہے انیس ناگی کا ناول "پتلیاں" ۲۰۰۱ میں جمالیات لاہور سے شائع ہوا۔

اس ناول کا مرکزی کردار جمیل ہے اور ناول کی کہانی جمیل اور اس کی خانگی زندگی کی ٹوٹ پھوٹ کے ارد گرد گھومتی ہے۔انیس ناگی کا یہ ناول وجودی حوالے سے خاصی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس ناول میں تمام کردار بوجھل، تھکی ہوئی بے ثمر زندگی کا بوجھ اُٹھائے، وقت کے بے رحم ہاتھوں میں پتلیاں بنے نظر آتے ہیں۔ جس کی ڈور حالات کے ہاتھوں میں ہے اور حالات ہمیشہ انسان سے زیادہ طاقتور ہوتے ہیں۔ زندگی ان کے لیے بذات خود کسی عذاب سے کم نہیں۔

ناول کا مرکزی کردار ایک ایسا فرد ہے جو سچائی کے ساتھ اپنی مرضی سے زندہ رہنا چاہتا ہے وہ انصاف پسندی کی قدروں کے ساتھ اپنی شخصیت کو ایک مکمل انسان کی حیثیت سے محسوس کرنا چاہتا ہے لیکن بدقسمتی سے آپس کے سامنے جو معاشرہ ہے وہ ان قدروں کا حامل نہیں ہے اس فرد کا سامنا جس نظام سے ہوتا ہے اس میں غیر جمہوری رویے، غیر منصفانہ سماج منافقت پر مبنی سوسائٹی اور بے ایمانی کا کلچر ہر طرف پھیلا ہوا ہے۔ پورے سماج میں وہ اکیلا ہے اس لیے نہ تو اس نظام کو بدل سکتا ہے اور نہ بدلنا چاہتا ہے۔ناول کا آغاز چار پڑھے لکھے مگر بے روزگار نوجوانوں کی آپس میں گفتگو سے ہوتا ہے امجد، احمد ابرار اور انور زندگی کی مشقت اور بوجھ تلے خود کو محسوس کرتے ہیں اگرچہ وہ ڈاکٹر اور انجینئر ہیں مگر پھر بھی ان کے لئے کوئی جائے پناہ نہیں۔ایک

انتشار اور بد حواسی ان کے رگ وپے میں پھیلتی ہی چلی جا رہی ہے، ایک طرف وہ اپنی بے روز گاری سے نالاں اور دوسری طرف معاشرتی قدروں سے تصادم، تمام نوجوان اپنی شناخت چاہتے ہیں مگر بے چارگی اور گھٹن ان کے سامنے دیوار کی طرف کھڑی ہے۔ وقت کی بے مہر ساعتیں اور حالات کا پر تشدد جبر انہیں راستہ دینے کو تیار نہیں اور بے اختیاری ہے کہ ہر وجود پر حاوی نظر آتی ہے۔ جب سب دوست اپنے لمحہء موجود کو تبدیل کرنے کے لیے مقابلے کے امتحان کی تیاری کا پروگرام ترتیب دیتے ہیں تو ہونے والی گفتگو اور مکالموں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کس طرح بے کاری کا زہر اور بے اختیاری کا روگ ان کی زندگیوں کو دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے۔ چاروں کردار ایک پتلی کی مانند ہیں۔ جس پتلی کی ڈور وقت کے بے رحم ہاتھ میں ہے اور اندھیرا چاروں سمت سے ان کے تعاقب میں ہے۔

پورے ناول میں ایک تھکن، اداسی، بے زاری، بے بسی، قنوطیت، بے معنی شب و روز کا طلسم، اور بوجھل فضا حاوی ہے۔ جمیل خود ایک آئیڈیلسٹ ہے۔ بلند آدرش کا حامل فرد مرکزی کردار ہے۔ زیرِ تحقیق ناول اس کردار کی جدوجہد کے ارد گرد گھومتا ہے۔ وہ نفسیات جیسے مضمون میں پی ایچ ڈی ہے۔ مگر اس کی سب نفسیات دھری کی دھری رہ جاتی ہے جب زندگی کے تلخ حقائق سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ جمیل لیکچرار شپ سے مستعفی ہو کر ایک اخبار میں کالم نویسی شروع کرتا، وہ زرد خیالات کا مالک ہے اس ناول میں جمیل ان لوگوں کا ایک نمائندہ کردار ہے جو زندگی کو اپنی شرائط پر گزارنا چاہتے ہیں وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔ بلند نظریات کا مالک ہے مگر انہی نظریات سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتا ہے اور یوں اپنی زندگی میں اپنے ہی وجود سے بیزار نظر آتا ہے۔ زندگی جمیل کے لئے ناکردہ گناہوں کی سزا سے کم نہیں، خانگی ماحول سے عدم مطابقت اپنے بیٹے امجد سے تلخ کلامی، اپنی بیوی پروین کے ساتھ ناخوشگوار اور ناآسودہ ازدواجی تعلق، راحت سے ادھورا تعلق، ماحول سے عدم مطابقت، یہ تمام عوامل اسے مل کر کھوکھلا کر کے ایک وجودی کردار میں ڈھال دیتے ہیں اور اس کے بدن کی عمارت دھڑام سے زمین بوس ہو جاتی ہے۔

بالآخر وہ وقت کے اندھیروں میں گم ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت حال کے بارے میں انیس ناگی کا ماننا ہے کہ ہر وجود بذاتِ خود ایک مسئلہ ہے خود اپنے لئے بھی اور دوسروں کے لیے بھی۔ یہ مسئلہ دراصل جینے اور مرنے کا ہے۔ درحقیقت ایسی حالت میں مرنا آسان تر ہے اور جینا مشکل ترین۔ خاص طور پر ان خطوں میں جہاں زندگی ایک بارود خانہ ہو، جہاں ہر ذی نفس دوسرے کو فریب دینے کے لیے ہر وقت تیار ہو، جہاں اضطراب میں رہنا ایک دائمی صورت حال ہو۔ یہ اضطراب باطن میں ایک کیڑے کی طرح خاموشی سے لہو پیتا

رہتا ہے۔ پھر ایک دن ایسا آتا ہے کہ آدمی اندر سے منہدم ہو جاتا ہے اور ظاہری طور پر وہ زندگی کے میلوں میں گھومتا پھرتا ہے جمیل بھی ایسے میلے میں چلتا پھرتا تھک گیا تھا۔ اس صورت حال میں جمیل اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ انسان اور زندگی کی تہہ میں فریب اور کراہت کے سوا کچھ بھی نہیں۔

جمیل نمائندہ کردار ہے دوسرے کرداروں میں اس کا بیٹا امجد، بیوی پروین اور بیٹی رابعہ کی کہانی بھی ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ امجد اس کا بیٹا ہے جو ڈاکٹری کرنے کے بعد بے روز گاری کاٹ رہا ہے اور اپنے تمام تر حالات کی ذمہ داری اپنے والدین پر عائد کرتا ہے وہ بد تمیز، گستاخ اور منہ پھٹ ہے۔ دراصل اس کردار کے ذریعے انیس ناگی جنریشن گیپ کو سامنے لاتے ہیں کہ نئی نسل اور پرانی نسل میں کتنا بعد آ گیا ہے۔ امجد جلد از جلد اپنے حالات تبدیل کرنا چاہتا ہے مگر وہ حالات کے سامنے بے بس اور بے اختیار ہے۔

وہ اگرچہ اپنے حالات تبدیل کرنے کے لیے ایسی شادی کے لیے خود کو تیار کرتا ہے جو اسے مستحکم کر سکے اور اس کی منہدم شخصیت کو تعمیر ہو سکے۔ وہ رعنا کی بہن شگفتہ سے بھی شادی کے لیے راضی ہو جاتا ہے مگر عین وقت پر وہ کسی اور سے شادی کر لیتی ہے۔ یوں اس کے ہاتھ سوائے ٹوٹ پھوٹ اور ہزیمت کے کچھ نہیں آتا۔ " ہاتھ آیا نہیں کچھ رات کی دلدل کے سوا" کے مصداق وہ بے رحم زندگی کے تھپیڑوں کی زد میں ہے۔

پروین جمیل کی بیوی ہے وہ روحانی طور پر بے خانماں اور جلاوطن ہے۔ اس کی شادی جمیل کے ساتھ ہوتی ہے مگر آج تک وہ اپنے دل میں عمران کی محبت کی کسک کو لئے پھرتی ہے۔ وہ مقامی کالج میں فلسفے کی پروفیسر ہے۔ نا آسودہ ازدواجی زندگی، معاشی بد حالی، کشیدہ گھریلو حالات، ادھوری خواہش، ٹوٹے خواب پروین کے دامن کو تار تار کرتے رہتے ہیں۔ زندگی پروین کے لیے مفلس کی قبا ہے، جس کے دامن کو وہ پیوند لگا لگا کر تھک چکی ہے۔ جمیل کی سرد مہری اور عمران کے لیے سانسیں لیتی محبت پروین کو دوہری اذیت میں مبتلا رکھتی ہے۔

سوپتلیاں کے کردار دوہری اذیت میں متلا ہیں وہ موجود پر قانع نہیں رہنا چاہتے بلکہ اس کو بدلنے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔ وہ اپنے باطنی حصار کو توڑ کر وقت کے تیز دھارے میں اترنے کی خواہش بھی رکھتے ہیں۔ اور کسی دلدل میں اترنے اور اپنے بے اعتبار اور بے بس ہوتے چلے جانے کی کیفیت سے آزاد ہونے پر آمادہ بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ظاہری تحرّک انہیں موجود کے جبر اور حصار سے باہر لانے کے بجائے، اس جال میں مزید الجھانے کا باعث بنتا ہے۔

ان کرداروں کے علاوہ راحت کا کردار بھی ناول میں موجودگی کا اعلان کرتا ہے۔ وہ خود ایک مجبوری کا روپ بن کر ناول میں ظاہر ہوتی ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے مگر خاوند سے علیحدگی کے بعد آزاد زندگی بسر کرنے کی

خواہش مند، مگر حالات کا بھنور اس کے پاوں میں زنجیر ڈالے ہوئے ہے۔ماں باپ اور اس کا ایک رشتہ دار کزن اس کی آزادی پر قدغن لگائے بیٹھے ہیں۔

جمیل اور راحت کا تعلق بھی گومگو کی سی کیفیت رکھتا ہے۔ دونوں پیش قدمی بھی کرنا چاہتے ہیں مگر پس منظر میں بھی رہنا چاہتے ہیں۔ دونوں آپس میں ملاقاتیں بھی جاری رکھتے ہیں مگر کھل کر اظہار بھی نہیں کرتے۔ پھر بھی کوئی ایسی کوشش ہے جو انہیں باندھ کر رکھتی ہے۔راحت کو نا آسودگی اور نارسائی کا زہر بھی ڈس رہا ہے وہ نام نہاد شرافت اور نیک نامی کے ڈر سے ہمیشہ دبی دبی رہتی ہے اور ایک بے اختیاری، بے بسی اور بیزاری اس کے ساتھ آکاس بیل کی طرح چمٹی ہوئی ہے۔ راحت کا ساتھ دینے والا اسی کا کزن اسے اپنی جنسی ہوس کا نشانہ بنا کر اسے حاملہ کر دیتا ہے۔یوں زندگی اس کے لیے کسی بھی قسم کے مفہوم سے عاری ہو جاتی ہے اور اس گناہ کے احساس سے دب کر اور بے معنویت کا زہر پی کر خودکشی کر لیتی ہے۔

اس ناول میں دو چیزیں خصوصی توجہ کا تقاضا کرتی ہیں ایک تو اس کا ٹھیٹھ معروضی اسلوب، دوسرے بیزاری کی وہ کیفیت جو ناول کی ہر صورت حال پر حاوی ہے۔ اس دور میں ذہین لوگوں کی نفسی کیفیت کا یہ معروضی تجزیہ اپنی نوعیت کی ایک اہم کاوش ہے۔ مشاہدے کی گہرائی کی واردات سے الجھے پن کو قبول نہیں کرتی ہے۔ناول میں جو بدمزہ، کسیلا ذائقہ پھیلا ہوا ہے وہ قاری کی زبان پر بھی فنی چابکدستی کے ذریعے پہنچ جاتا ہے۔ جس کو کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔

ناول کے تمام کردار زندگی کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔ جمیل ملازمت سے استعفیٰ دے کر اپنے لئے زندگی چھین لینا چاہتا تھا، مگر حالات اس سے زندگی چھین لیتے ہیں اس کا آئیڈیلزم سب سراب نکلتا ہے اور آخر میں لایعنیت کا شکار ہو کر سب گھر والوں سے لاتعلق ہو کر اچانک ایک دن دریا میں گم ہو جاتا ہے۔ امجد، پروین راحت سب اسی راہ کے مسافر ہیں۔ بالآخر راحت کی زندگی کی انجام بھی اسی طرح ہوتا ہے اور پروین ایک باری ہوئی زندگی کو سینے سے لگائے پھرتی ہے اور یہ نتیجہ اخذ کرتی ہے کہ انسان حالات کی جبریت سے کبھی آزاد نہیں ہو سکتا۔ ناول میں وجودی رویے کی نشاندہی جابجا اس کے کرداروں کی زبانی ہوتا ہے۔

یہ ناول وجودی احساسات کے لیے خاص اہمیت کا حامل ہے، جس میں مصنف ایسے کردار متعارف کروا رہا ہے جن کا تعلق تیسری دنیا سے محسوس ہوتا ہے۔ جو بے رحمی اور سفاکیوں کا شکار ہو کر اپنے وجود اور معاشرے سے بیگانہ ہو گئے ہیں۔ اس لئے بے معنویت کی آخری منزل موت ہے۔ وجودی مباحث کے حوالے سے اس ناول کو خاص اہمیت حاصل ہونے کے باعث، بے فرد کی آزادی، انتخاب کا مرحلہ، بے بسی اور

بے اختیاری کی صورت حال اور داخلی کرب کے ذریعے وجودی مسائل کو بڑے واضح انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ خواتین کرداروں میں پروین اور راحت بے حد اہم کردار ہیں جو معاشرے کی نمائندگی بھی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور وجودی بحران سے بھی دوچار ہیں۔ مختصراً کہا جاسکتا ہے "پتلیاں" کے تمام کردار بے بسی کی تصویریں بنے نظر آتے ہیں اور اُن کا وجودی کرب انہیں ویران کیے جارہا ہے۔

تحقیقی نتائج

1۔ انیس ناگی کی وجودی شخصیت کے پیچھے ان کے نجی حالات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ انیس کے ناولوں میں نظریہ وجودیت کی جھلک صاف دیکھائی دیتی ہے۔ ان کی تحریروں کے مطالعہ کے دوران قدم قدم پر وجودی صورت حال سے واسطہ پڑتا ہے جو ان کے وجودی ہونے پر دلیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ جدید عہد کا انسان جس طرح وجودی بحران اور داخلی کرب میں مبتلا ہے اس کا ذکر انیس ناگی کے ناولوں کا مرکزی نقطہ ہے۔ ان کی ناول نگاری میں مایوسی، خوف، تشویش، دہشت، کراہت، بیگانگی، جبریت، لایعنیت اور لاتعلقی وغیرہ کے عناصر پائے جاتے ہیں۔

2۔ انیس ناگی کی ناول نگاری پر انگریزی ادب نے گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ انیس ناگی کا ادب کے بارے میں نظریہ مغربی ادب سے مستعار ہے۔ ان کے ذہن کی ساخت سے لے کر خیالات اور نظریات تک انگریزی ادب کی دین ہے۔ اپنے تخلیقی سفر کے دوران سورین کرکیگارڈ، ژاں پال سارتر، البیر کامیو، اور کافکا وغیرہ کی تحریروں کے مطالعے سے ان کی باطنی وجودیت کو مزید تقویت ملی تو وہ اول سے آخر تک وجودی تخلیق کار بن گئے۔ سارتر انیس ناگی کا پسندیدہ ادیب تھا۔ جس کے نظریات اور فلسفۂ وجودیت کے وہ بے حد قائل تھے۔ شاید اس لیے وہ فرد کی آزادی کی بات کرتا ہے۔ سارتر کے لیے لائبریری معبد تھی تو انیس ناگی کے لیے بھی کسی فردوس بریں سے کم نہ تھی۔ حتیٰ کہ انہوں نے اپنی آخری سانسیں اسی معبد میں لیں۔ شاید ان کے نزدیک کتابیں اور حرف زندگی سب سے بڑی صداقت ہیں۔

3۔ ناول پتلیاں کے تمام کردار کشمکش اور دوہری اذیت میں مبتلا ہیں نہ ہی وہ موجودہ حالات پر خوش ہیں اور نہ ہی انہیں تبدیل کرنے کے لیے جدوجہد کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ناول کے تمام کردار زندگی کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔ تمام کردار ایک نفسیاتی بے بسی کی تصویر بنے ہوئے نظر آتے ہیں۔

سفارشات

تحقیقی نتائج کی روشنی میں درج ذیل سفارشات پیش کی جاتی ہیں:

1- انیس ناگی کی ناول نگاری پر نفسیاتی پہلو کے حوالے سے کام کیا جاسکتا ہے۔

2- انیس ناگی کی تمام تصانیف پر تحقیقی کام کیا جائے، تاکہ ان کی فکر پر مختلف ادبی نظریات کے اثرات کو جانچا جاسکے۔

3- انیس ناگی کے منتخب ناولوں کا ان کے معاصر ناول نگاروں سے تقابل کروایا جاسکتا ہے۔

4- انیس ناگی کے ناولوں کا لسانی اور اسلوبیاتی حوالے سے جائزہ لیا جاسکتا ہے۔

کتابیات

بنیادی مآخذ

" انیس ناگی، ڈاکٹر، ”پتلیاں“، گنگارام فیشن مال روڈ، لاہور، ۲۰۰۱ء

ثانوی مآخذ

احسن فاروقی، ڈاکٹر، اُردو ناول کی تنقیدی تاریخ، لاہور: سندھ ساگر اکادمی، س ن

احمد عقیل روبی، کھرے کھوٹے، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، اشاعت دوئم، ۲۰۰۹ء

انیس ناگی، "ایک ادھوری سرگزشت" لاہور، جمالیات، ۲۰۰۸ء

انیس ناگی، عمومی نفسیات، لاہور، اردو سائنس بورڈ، ۱۹۹۵ء

انیس ناگی، وجود اور نفسیات، لاہور: جمالیات، جنوری ۱۹۹۵ء

سی۔اے قادر، ڈاکٹر، وجودیت، مشمولہ: ادب فلسفہ اور وجودیت، احسن نگارشات لاہور، ۱۹۹۲ء

جاوید حسین، قاضی، بیس عظیم فلسفی، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۲ء

جاوید حسین، قاضی، وجودیت، لاہور، مکتبہ میری لائبریری، ۱۹۷۳ء

حسن ریاض حسین، پاکستان ناگزیر تھا، شعبہ تصنیف و تالیف کراچی، یونیورسٹی کراچی، ۱۸۸۲ء

خالد اشرف، برصغیر میں اُردو ناول، لاہور: فکشن ہاؤس ۲۰۰۵ء

زائد مسعود، (مرتبہ) "انیس ناگی ایک وجودی ناول نگار" حسن پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۷ء

سہیل بخاری، ڈاکٹر، ناول نگاری، لاہور: میری لائبریری، ۱۹۶۶ء

سارتر ژاں پال "وجودیت اور انسان دوستی"، مترجم شیخ ظہور الحق، مشمولہ: نئی تنقید، مرتبہ: کلیم

شاہین مفتی، ڈاکٹر، ”انیس ناگی شخصیت و فن“ اسلام آباد، اکادمی ادبیات، ۲۰۰۱ء

شاہین مفتی، ڈاکٹر "اُردو ادب کے انٹی ہیرو، لاہور حسن پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء

شیبا عالم، ڈاکٹر، اُردو کے نمائندہ ناول نگاروں کا تاریخی شعور، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء

صدیق، سوندھی ٹرانسلیشن سوسائٹی گورنمنٹ کالج، لاہور، ۲۰۱۵ء

عبد السلام، پروفیسر، اُردو ناول بیسویں صدی میں، کراچی: اُردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۷۳ء

فہیم شناس کاظمی (مرتب)، ”سارتر کے مضامین“ کراچی، پبلی کیشنز بک ٹائم، ۲۰۱۶ء

محمد جعفر تھانیسری ،مولانا، کالا پانی ،سنگ میل پبلیکیشنز ،لاہور، ۱۸۸۱ء
ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، اُردو ناول کرداروں کا حیرت کدہ، کراچی: فضلی بک، ۲۰۱۵ء
ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، اُردو ناول کے بدلتے تناظر، لاہور، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، ۲۰۰۷ء

رسائل و جرائد

دانشور، لاہور، سہ ماہی ادبی رسالہ، اکتوبر ۲۰۰۰ء
دانشور، لاہور، سہ ماہی ادبی رسالہ، جنوری ۲۰۰۱ء
راوی سالانہ میگزین، مئی ۱۹۹۲ء
راوی سالانہ میگزین، ۲۰۱۱ء
معیار، اسلام آباد، جنوری۔ جون ۲۰۱۵ء

English Articles:

Kazy Jawed, A tribute to AnisNagi, Lahore: The News Sunday 17 Oct, 2010

English Books:

Azad,Abul Kalam "India Wins Freedom" Orient Longman Hyderabad (India) 1986

AnisNagi, Makers of Modern Pakistani Literature, Lahore: Jamaliyat, 1995

Blackham,H.J "Six Existentialism thinker" Routeldge & ,Kegan Paul Londen1982

Walter Kalfman "Existentialism From Dostoevsky To Sartre" New York 1956

Macquarrie, John "Existentialism" Penguin Books Great Britain 1980

Barrett, William "What is Existentialism"Grove Press IneNew York 1964